نامدار اور بوبی کے کارنامے ___ 3
کل نہیں، آج
ستّار طاہر

کل نہیں، آج

نامدار اور بوبی کے کارنامے

حصّہ سوم

ستّار طاہر

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

غائب ہو گیا!

نامدار نے سر اُٹھا کر عورت کی طرف دیکھا۔ دس منٹ سے یہ عورت، جس کا نام سکینہ تھا، اس کے سامنے بیٹھی اپنی داستان سُنا رہی تھی۔ اُس نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اُسے جو کُچھ بتایا تھا، اُس کا خلاصہ چند لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے:

تین دِن پہلے اُس کا خاوند یہ کہہ کر صُبح کے آٹھ بجے گھر سے نکلا کہ وہ ایک

ضروری کام سے شہر جا رہا ہے۔ اُس نے یہ نہیں بتایا کہ اُسے شہر میں کیا کام ہے۔ بس اتنا کہا کہ وہ اگلے دِن شام تک واپس آ جائے گا۔ لیکن اب اُسے گئے تین روز ہو چکے ہیں اور وہ واپس نہیں آیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اتنے دِنوں تک گھر سے باہر رہا ہو۔" سکینہ نے سِسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

سکینہ اِسی قصبے کی رہنے والی تھی اور نامدار اُس کے شوہر کو جانتا تھا۔ اُس کا نام رشید علی تھا اور وہ ایک چھوٹی سی دُکان کرتا تھا۔ اُس دُکان سے اِس گھرانے کی گزر بسر ہوتی تھی۔ رشید اور سکینہ کی ایک بیٹی عائشہ تھی، جو سات برس کی ہوگی۔ اُس کے علاوہ اُن کی کوئی اور اولاد نہ تھی۔

نامدار نے پوچھا۔ "کیا وہ اِس سے پہلے بھی شہر جایا کرتا تھا؟"

"ہاں، دوسرے تیسرے ہفتے۔ لیکن صُبح جاتا اور شام کو واپس آ جاتا۔ وہ دُکان کے لیے سودا خریدنے جایا کرتا تھا۔"

"کیا وہ اس بار بھی سودا لینے تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔" سکینہ نے جواب دیا۔ "وہ ایک ہفتہ پہلے شہر گیا تھا اور دُکان کا پورا سودا خرید لایا تھا۔"

"اُس نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے شہر میں کیا کام ہے؟"

"بالکل نہیں، حالانکہ اِس سے پہلے جب اُسے شہر جانا ہوتا تو کئی دِن پہلے بتا دیا کرتا تھا۔ لیکن اُس روز صُبح کو ناشتے کے بعد وہ کہنے لگا کہ سکینہ، میں شہر جا رہا ہوں۔ کل شام تک آ جاؤں گا۔"

"تُم نے یہ نہیں پوچھا کہ جب وہ دُکان کا سودا لے آیا ہے تو پھر شہر کیوں جا

رہا ہے؟" نامدار نے سوال کیا۔

"میں نے پوچھا تھا۔"

سکینہ نے جواب دیا۔ "اُس نے کہا کہ بس ایک ضروری کام ہے۔"

"شہر میں اُس کا کوئی رشتے دار ہے؟"

"شہر میں تو کیا کہیں بھی اُس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔" سکینہ نے جواب دیا۔ "میرے بھی تمام عزیز فوت ہو چکے ہیں۔"

"اُس کا کوئی دوست جس کے پاس وہ شہر میں ٹھہرتا ہے؟"

"کوئی دوست نہیں۔ وہ صُبح جاتا اور سودا لے کر شام کو لوٹ آیا کرتا۔" سکینہ بولی۔ "اگر اس کا شہر میں کوئی دوست ہوتا تو مُجھ سے ضرُور ذکر کرتا۔"

نامدار نے اندازہ لگایا کہ بات اُلجھتی جا رہی ہے۔ رشید علی تین دِن سے گھر نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ اُس نے پھر غم زدہ سکینہ پر ایک نگاہ ڈالی اور پوچھا۔

"کیا وہ پریشان دِکھائی دیتا تھا؟"

"ہاں۔" سکینہ بولی۔ "بہت پریشان تھا۔ کئی دِنوں سے میں یہ محسوس کر رہی تھی۔ ایک دو بار پوچھا تو وہ ٹال گیا۔"

نامدار نے سوچنا شروع کیا۔ پہلی بات تو یہی پریشان کُن تھی کہ اچانک رشید علی نے شہر کا رُخ کیوں کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شہر میں اُسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ بعض حادثے جان لیوا بھی ہوتے ہیں۔

"تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" نامدار نے پوچھا۔

سکینہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولی۔ "میں تو سمجھتی ہوں کہ میری

قسمت پھُوٹ گئی ہے۔ تین دِن ہو گئے اور اُس کی کوئی خبر نہیں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

نامدار نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "میں اُس کا پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

سکینہ نے آنسوؤں بھری آنکھیں اوپر اُٹھا کر دیکھا اور بولی۔ "آپ شہر جائیں گے؟"

"ہاں۔ تُم اب گھر جاؤ۔ میں شہر جانے کی تیّاری کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ میرے آنے سے پہلے ہی واپس گھر آجائے۔"

سکینہ نامدار کو دُعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ نامدار نے لباس تبدیل کیا اور پھر اصطبل کی طرف چل دیا جہاں اُس کا گھوڑا بوبی تھا۔

کون ہو تم؟

نامدار نے بوبی کو تھپتھپایا اور کہا۔ "شہر چلنا ہے۔ سمجھ گئے؟"

بوبی نے اپنے نوجوان مالک کی بات سمجھ لی اور ہنہنانے لگا۔ شہر اِس قصبے سے سترہ میل کے فاصلے پر تھا۔ سات میل کچّا راستہ تھا، اُس کے بعد بڑی سڑک آ جاتی تھی جو پُختہ تھی۔ اِس سڑک پر بھی ٹریفک برائے نام تھی۔ کوئی اِکّا دُکّا دیہاتی تانگہ یا پھر کوئی بس سڑک پر سے گُزرتی نظر آ جاتی تھی، ورنہ

سڑک صاف رہتی تھی۔

نامدار نے سفر کے دوران میں سوچ لیا تھا کہ رشید علی کو شہر میں کہاں تلاش کرنا ہے۔ وہ سب سے پہلے غلّہ منڈی جانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ رشید علی کی وہاں ضرور واقفیت ہوگی کیونکہ ہر دوسرے ہفتے وہ سودا لینے غلّہ منڈی جاتا تھا۔ مُمکن ہے وہاں سے اُس کے بارے میں کوئی ایسا سُراغ مل جائے جس سے اُس کی تلاش میں آسانی پیدا ہو جائے۔

غلّہ منڈی کے علاوہ اُس کا دوسرے اہم ٹھکانوں پر بھی جانے کا ارادہ تھا۔ سترہ میل کا فاصلہ تیز رفتار بوبی نے دو گھنٹے میں طے کرلیا۔ جب وہ غلّہ منڈی میں داخل ہوئے تو اُس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ منڈی میں اُس وقت لوگوں کا رش ختم ہو چکا تھا۔ نامدار نے منڈی کا ایک چکّر لگایا اور پھر بوبی کو ایک جگہ روک کر نیچے اُترا۔

نامدار بوبی کے پاس کھڑا آڑھتیوں کے بورڈ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بوبی کی لگام پکڑی، پھر کُچھ دور جا کر ایک جگہ بوبی کو باندھا اور سامنے والی دُکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دُکان کا مالک بھاری جسم کا عُمر رسیدہ آدمی تھا۔ اُس کی داڑھی مونچھیں تک سفید ہو رہی تھیں۔ نامدار نے سلام کیا تو بُوڑھے آڑھتی نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔ "بیٹے، کیا چاہیے تمہیں؟"

نامدار نے جواب دیا۔ "میں آپ کو ایک زحمت دینے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے بُوڑھے کو رشید علی اور اُس کی بیوی کے بارے میں بتایا۔ بُوڑھے آڑھتی نے بڑی ہمدردی اور توجّہ سے ساری بات سُنی اور بولا:

"بیٹے، آرام سے بیٹھو۔ چائے پانی پیو۔ میں اپنے ملازموں کو دوسرے آڑھتیوں کی دُکانوں پر بھیجتا ہوں۔ وہ پتا کر کے بتائیں گے کہ رشید علی کس نے ہاں سے سودا لیتا تھا۔" پھر ایک نوکر کو آواز دے کر کہا۔ "ایک ٹھنڈی

بوتل لے کر آؤ۔"

مُلازم بوتل لے کر آ گیا تو آڑھتی نے دو نوکروں کو پوری بات سمجھائی اور دوسرے آڑھتیوں کے پاس بھیج دیا۔ پھر وہ نامدار سے بولا۔ "ابھی پتا چل جائے گا۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ گاؤں سے جو دُکان دار آتے ہیں وہ ایک ہی آڑھتی سے مال خریدتے ہیں۔ کبھی کبھار پیسے کم ہو جائیں تو اُدھار بھی کر لیتے ہیں۔ دو تین سال سے جو دُکان دار غلّہ منڈی آ رہا ہو اُس کا پتا آسانی سے چل سکتا ہے۔"

چند منٹ بعد بُوڑھے آڑھتی کا ایک نوکر واپس آ گیا اور بولا۔ "پتا لگ گیا ہے، جی۔ جس آدمی کا آپ نے پوچھا تھا وہ سراج دین آڑھتی کے ہاں مال لینے آتا تھا۔" نامدار کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آڑھتی کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔ "میرا آدمی تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔"

"جی نہیں۔ شکریہ۔" نامدار نے کہا۔ "میں اُس آڑھتی کی دُکان کا بورڈ پڑھ چکا ہوں۔ آسانی سے پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھّا، تمہاری مرضی۔" آڑھتی بولا۔ "خُدا کرے اُس کا پتا چل جائے اور وہ خیر خیریت سے ہو۔"

بوبی کی لگام پکڑے نامدار سراج دین آڑھتی کی دُکان کی طرف چل دیا۔ دُکان کے پاس جا کر اُس نے بوبی کو ایک طرف باندھا اور دُکان کے اندر داخل ہو گیا۔ سراج دین چالیں پینتالیس برس کا کھُلے اور لمبے قد کا آدمی تھا۔ اُس کا چہرہ بہت کرخت تھا۔ نامدار نے اُسے سلام کیا تو اُس نے جواب دے کر پُوچھا۔ "کیا کام ہے؟" اُس کا لہجہ سخت تھا اور اُس میں حقارت بھی پائی جاتی تھی۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" نامدار نے پوچھا۔

سراج دین نے اُسے کچھ ناراض نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کیا چاہیے؟ جلدی سے بتا دو؟"

"قصبہ فرید پور کا دُکان دار رشید علی آپ سے سودا لینے آیا کرتا ہے۔" نامدار نے کہا۔

"یہاں کئی لوگ ہر روز مختلف دیہات سے آتے ہیں۔ اُن میں رشید علی بھی شامل ہے۔"

"میں اس کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

"اُس کا پتا اُس کے قصبے میں جا کر کرو۔" سراج دین تلخی سے بولا۔

”وہ تین دِن سے غائب ہے۔“ نامدار بولا۔ ”شہر آیا تھا، واپس نہیں گیا۔“

سراج دین نے آنکھیں سُکیڑ کر نامدار کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا وہ تمہارا کُچھ لگتا ہے؟ میرا مطلب ہے رشتے دار۔۔۔۔“

”میرے قصبے کا ہے۔ اُس کی بیوی بہت پریشان ہے۔“ نامدار بولا۔

”مُجھے اُس کے متعلّق کُچھ علم نہیں۔“

”آخری بار وہ آپ سے کب ملا تھا؟“ نامدار نے پوچھا۔

سراج دین نے غصّیلی نگاہوں سے نامدار کو دیکھا اور بولا۔ ”تین دِن پہلے وہ دوپہر کے وقت یہاں آیا تھا، پھر چلا گیا۔

نامدار اب تک سراج دین اور اُس کی دُکان کا جائزہ لے چکا تھا۔ دو ایک

ملازم کُچھ دور بیٹھے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ اُن کی گفتگو سُننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ نامدار نے آہستہ آہستہ نرم لہجے میں بات شروع کی :

"آپ کا وہ پُرانا گاہک ہے۔ اطمینان سے میری بات سُنیے اور اُس کا جواب دیجیے۔"

"کیا جواب دوں؟" وہ تیزی سے بولا۔ "جو میں جانتا تھا، وہ بتا دیا۔"

"آپ بتا رہے ہیں کہ وہ پرسوں آپ کے پاس آیا تھا۔ اُس سے چند دِن پہلے وہ آپ سے سودا لے گیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ پرسوں آپ کے پاس کس لے آیا تھا؟"

"کون ہو تُم؟" سراج دین بولا۔ "جاؤ، اپنا کام کرو۔"

"میں اپنا کام ہی کر رہا ہوں۔" نامدار نے جواب دیا۔ "کیا آپ کو اُس کی

بیوی کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں؟"

"کس کس کی پریشانی کو سُنوں؟ اپنا کاروبار نہ کروں؟" وہ بولا۔

"رشید علی برسوں سے آپ کی آڑھت پر آرہا ہے۔ کم از کم۔۔۔۔۔"

اِس سے پہلے کہ نامدار اپنی بات پوری کرتا سراج دین نے بات کاٹی اور بولا۔ "وہ پرسوں آیا تھا۔ کہنے لگا ایک کام سے شہر آیا ہوں۔ دس پندرہ منٹ بیٹھا، پھر چلا گیا۔ مُجھے نہیں معلوم کہاں گیا۔ لیکن وہ کہیں گُم نہیں ہو سکتا۔ بچّہ تو نہیں ہے۔"

نامدار کو غصّہ تو بہت آیا لیکن پی گیا۔ سراج دین آڑھتی کا سلوک اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ دُکان سے باہر نکل کر وہ سوچنے لگا کہ اب رشید علی کو کہاں تلاش کرنا چاہیے!

ایمرجنسی وارڈ

آخروہ بوبی کی لگام تھامے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ غلّہ منڈی سے باہر نکلنے والا ہی تھا کہ ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور بولا۔ ”میرے ساتھ آئیے۔“

وہ شکل و صورت اور لباس سے منڈی میں کام کرنے والا کوئی مزدور دِکھائی دیتا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا غلّہ منڈی کے باہر ایک بازار کی بغل میں گلی کے سامنے رُک گیا اور بولا۔ ”میرا نام شریف ہے۔ میں یہیں منڈی

میں کام کرتا ہوں۔"

نامدار خاموش رہا۔ شریف نے اپنی بات جاری رکھی۔ "رشید علی اُسی آڑھتی کے ہاں آتا تھا جہاں سے آپ آئے ہیں۔ وہ پرسوں بھی آیا تھا۔ میری اُس کے ساتھ علیک سلیک ہے۔ پرسوں اُس کا سراج دین سے جھگڑا ہوا تھا۔"

"کس بات پر؟" نامدار نے تیزی سے پوچھا۔ "یہ تو مجُھے معلوم نہیں۔" شریف نے کہا۔

"کچُھ تو سُنا ہوگا۔" نامدار نے کرُیدا۔

"ہم ہوئے مزدُور۔ دُکاندار اپنی باتوں میں ہمیں شریک کب کرتے ہیں۔ رشید علی دُکان پر آیا تھا اور سراج دین سے اُس نے کچُھ کہا تھا۔ سراج دین

نے اُونچی غصّیلی آواز میں کہا تھا کہ چلے جاؤ۔ میں نہیں سُنوں گا۔ اِس پر رشید علی نے کہا کہ تُم مُجھے پھنسا نہیں سکتے۔ آڑھتی غصّے میں آ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے رشید علی سے کہا کہ وہ اس کی دُکان سے نکل جائے۔ رشید علی ہوتا ہوا چلا گیا۔ میں اُس کے پیچھے بھاگا اور اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو اُس نے غصّے میں صرف اتنا کہا کہ تمہارا آڑھتی بے ایمان ہو گیا ہے، لیکن میں ایسے بے ایمانوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں کیا بات ہو سکتی ہے؟" نامدار نے پُوچھا۔

"اللہ جانتا ہے۔" شریف بولا۔

"تمہارا یہ آڑھتی سراج دین کیا آدمی ہے؟ تُم اِسے کب سے جانتے ہو؟"

"پکّا بے ایمان ہے۔" یہ کہہ کر شریف زور زور سے ہنسنے لگا۔

"کیا بے ایمانی کرتا ہے؟" نامدار نے پوچھا۔

"کم تولتا ہے۔ مزدوروں کی مزدوری مار لیتا ہے۔ پیسے توڑ توڑ کر دیتا ہے۔ لین دین میں ٹھیک نہیں۔ اپنا مطلب ہو تو موم کی طرح پگھل جاتا ہے، لیکن جب کام نکل جائے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔"

نامدار نے اُسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "تُم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تُم یہاں کب سے ہو؟"

"بیس سال تو ہو گئے ہوں گے اِسی منڈی میں مزدوری کرتے۔ سب کو جانتا ہوں۔"

نامدار نے اُسے بتایا کہ "رشید علی تین دِن سے گھر نہیں گیا، اُس کی بیوی پریشان ہے اور میں اُس کا پتا لگانے شہر آیا ہوں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا جی۔ اللہ خیر کرے۔" شریف بولا۔ "ویسے رشید علی آڑھت کی دُکان پر زیادہ دیر نہیں رُکا تھا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں جا سکتا ہے؟" نامدار نے پوچھا۔

"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے شہر میں اس کا کوئی یار بیلی ہو۔"

نامدار کُچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "میں اُس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ کُچھ نہ کُچھ سُراغ لگا کر ہی جاؤں گا۔ اگر تم سے پھر مِلنا ہو تو کہاں مل سکتا ہوں؟"

"وہ سامنے چائے کی دُکان ہے۔" شریف نے اُنگلی سے ایک چھوٹی سی دُکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں وہاں دِن میں کئی چکّر لگاتا ہوں۔ رات کو بھی منڈی میں رہتا ہوں۔ گھر گھاٹ کوئی نہیں ہے۔ چائے کی دُکان میں نہ ہوں تو وہاں سے لڑکا بھیج کر منگوا لیں۔"

نامدار نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اِسے رکھ لو۔ چائے پی لینا۔"

شریف نے شکریہ ادا کیا اور بولا۔ "خُدا کرے رشید علی مل جائے۔"

"تُم آڑھتی پر نظر رکھنا۔ میں آج ہی کسی وقت تم سے ملوں گا۔" آڑھتی سراج دین کا رویّہ اور شریف نے اُسے جو کُچھ بتایا تھا، وہ نامداد کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ دِل ہی دِل میں رشید علی کی سلامتی کی دُعائیں مانگتا ہوا بوبی پر سوار آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال کے اندر داخل ہوا۔ اس نے بوبی کو ایک درخت سے باندھا اور خود ہسپتال کے دفتر معلومات میں پہنچا۔ ڈیوٹی پر موجود افسر کو سارا ماجرا سُنایا۔ افسر نے ایک رجسٹر دیکھا۔

"پرسوں رات دو آدمی زخمی حالت میں لائے گئے تھے، جن کے نام پتے کا ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ آپ ان کو دیکھ لیں۔"

ڈیوٹی افسر نے اسے ایمر جنسی وارڈ کا راستہ بتایا تو وہ تیز تیز قدموں سے اُس طرف چل پڑا۔ جب وہ وارڈ کے اندر داخل ہوا تو پٹّیوں میں بندھے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ڈیوٹی نرس نے اس سے پوچھا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

نامدار نے اسے مختصر سارا ماجرا سُنایا اور کہا۔ "وہ زخمی جن کی شناخت نہیں ہو سکی۔"

"اوہ!" نرس بولی۔ "ان میں سے ایک کا انتقال چند گھنٹے پہلے ہو چکا ہے۔ اس کی لاش مُردہ خانہ پہنچا دی گئی ہے۔ دوسرا ابھی تک بے ہوش

ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

نرس نامدار کو اپنے ساتھ وارڈ میں لے گئی۔ وارڈ کے ایک گوشے میں ایک عارضی کیبن بنایا گیا تھا، شاید اس مریض کو دوسرے مریضوں سے الگ رکھنے کے لیے۔

ڈیوٹی نرس نے بستر پر لیٹے بے ہوش مریض کی طرف اشارہ کیا۔ سامنے بستر پر رشید علی بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کا رنگ ہلدی سے بھی زیادہ زرد ہو رہا تھا۔ نرس نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا اور کیبن سے باہر نکل کر اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ اُسی آدمی کی تلاش میں تھے۔"

نامدار سے کُچھ بولا نہ گیا۔ اُس نے صرف سر ہلا دیا۔ نرس بولی۔ "پرسوں

رات یہ زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ اِس کے پیٹ میں گولی لگی تھی اور بہت خون بہہ چُکا تھا۔ ڈاکٹر اِس کے متعلّق پر اُمّید ہیں۔ اسے شام تک ہوش آ جانا چاہیے۔" نامدار نے گلا صاف کر کے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ "یہ کیسے زخمی ہوا؟ کس نے اِسے گولی ماری؟ اِسے یہاں کون لایا تھا؟"

نرس بولی۔ "بہتر ہو گا آپ ہسپتال کے احاطے میں جو پولیس چوکی ہے، وہاں چلے جائیں۔ وہاں سے آپ کو معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

پولیس چوکی میں نامدار کو کئی منٹ تھانیدار کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں کوئی کام کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو نامدار اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ تھانیدار اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے پر خوشی دِکھائی دے رہی تھی۔

"نامدار، یہاں آپ کیسے آئے؟"

یہ تھانیدار ہاشم خان تھا جو ایک زمانے میں نامدار کے علاقے میں رہ چکا تھا اور اس پر نامدار کے خاندان کے بہت سے احسان تھے۔ وہ نامدار کی بہادری، ذہانت اور شرافت سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نامدار کو گلے لگایا۔

"یہ تو بتاؤ، یہاں کیسے آئے؟ خیریت ہے نا؟" نامدار نے آہستہ آہستہ تفصیل سے ہاشم خان کر سارا ماجرا سنایا۔ جب وہ بات ختم کر چُکا تو تھانیدار نے پہلے تو چائے کا حکم دیا، پھر فائل نکالی جو رشید علی کے بارے میں تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی بات بتاتا، نامدار نے پوچھا:

"آپ نے رشید علی کو پہچانا نہیں؟ وہ ہمارے علاقے کا ہے۔"

تھانیدار ہاشم خان نے شرمندگی سے سر جھُکا کر کہا۔ "سچّی بات تو یہ ہے کہ مُجھے کُچھ شُبہ ہوا تھا کہ وہ جانا پہچانا ہے، لیکن میں نے اس پر غور نہیں کیا۔"

نامدار نے ساری تفصیل جاننا چاہی تو تھانیدار ہاشم خان خاں نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور بولا:

"پرسوں رات فیض باغ کے علاقے میں پونے گیارہ بجے رات لوگوں نے گولی چلنے کی آواز سُنی۔ کُچھ آدمی باہر نکلے۔ اُنھوں نے فیض باغ چوک کے ایک گوشے میں تاریک جگہ ایک شخص کو کراہتے سُنا۔ وہ زخمی تھا اور اس کے پیٹ پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ دو آدمی اسے ہسپتال لے گئے۔ بس یہ سارا قصّہ ہے۔ پولیس ابھی تک کوئی سُراغ نہیں لگا سکی ہے۔ میں کئی بار اُس کو دیکھ چُکا ہوں کہ ہوش میں آجائے تو اُس کا بیان لکھوں۔"

”نرس نے کہا ہے کہ آج شام تک اسے ہوش آ جانا چاہیے۔“ نامدار نے کہا۔

”ہاں، گولی نکالنے کی وجہ سے بہت سا خُون نکل گیا۔“ تھانیدار بولا۔

”لیکن اُسے خون دے دیا گیا ہے۔“

اتنے میں چائے آ گئی۔ نامدار کا دِل نہ چاہ رہا تھا، پھر بھی اُس نے چائے کے ساتھ ایک دو بسکٹ کھا لیے تاکہ ہاشم خان بُرا نہ مانے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ قصبے میں رشید علی کی بیوی سکینہ اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ دِن کے چار بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اچانک اُسے کُچھ خیال آیا۔ وہ بولا:

"بوبی کو یہاں باندھنے اور اُس کے چارے کا انتظام ہو سکتا۔"

"بوبی؟ ارے!" ہاشم خان بولا۔ "اُس کے بارے میں تو میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ کہاں ہے وہ؟"

نامدار نے اُسے بتایا تو ہاشم خان بولا۔ "چوکی کے پچھواڑے کھُلی جگہ ہے۔ میں کسی کو چارہ لانے کے لیے کہتا ہوں۔"

نامدار اُٹھا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جب تک رشید علی کو ہوش نہ آ جائے، میں یہیں ٹھہروں گا۔ میں بوبی کو لے آؤں۔"

وہ پھر آئیں گے

سوا چھ بجے معلوم ہوا کہ رشید علی کو ہوش آ گیا ہے۔ نامدار جب ہاشم خان کے ساتھ وارڈ میں پہنچا تو وہاں ڈاکٹر موجود تھا۔ اس نے تھانیدار کر دیکھتے ہی کہا۔ "اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ چند دِنوں میں اُسے فارغ کر دیا جائے گا۔"

"میں اُس کا بیان قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔" ہاشم خان نے کہا۔

"میں ابھی اِس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"ڈاکٹر بولا۔ "ابھی وہ اِس حالت میں نہیں کہ آپ کے سوالوں جواب دے سکے۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہ کام کل صُبح تک ملتوی کر دیں۔"

"مگر۔۔۔"ہاشم خان کُچھ کہنے لگا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ ابھی آپ اس کے سامنے ہی نہ جائیں۔"

نامدار نے اپنا تعارف ڈاکٹر سے کرایا اور کہا۔ "کیا میں اُس سے مل سکتا ہوں؟"

ڈاکٹر نے نامدار کو ایک نظر دیکھا اور جواب دیا۔ "اسے دیکھ لیجیے، چند منٹ تک۔ زیادہ باتیں نہ کرنا۔"

نامدار کیبن میں داخل ہوا، اور آگے بڑھ کر رشید علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ

لیا۔ رشید علی نامدار کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر پھیکی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"اب تُم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ڈاکٹر سے ملا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ چند دِنوں میں گھر واپس چلے جاؤ گے۔" نامدار نے اُس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔

رشید علی نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔ "سکینہ ٹھیک ہے نا؟"

"سب خیریت سے ہیں۔ تُم اُن کے بارے میں کوئی فکر نہ کرو۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ڈاکٹر نے زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔ تمہیں مکمل آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس ہوں۔ تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں

گا اور کل پھر آؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

رشید علی کے چہرے کی رنگت بدلی۔ زرد چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔

"مُجھے اکیلا نہ چھوڑیے۔ وہ مُجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ پھر آئیں گے۔۔۔۔۔ وہ پھر یہی کریں گے۔ خُدا کے لیے۔۔۔۔!"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تُم پولیس کی حفاظت میں ہو۔"

ایک دو منٹ تک رشید علی کُچھ نہ بولا۔ آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹا رہا۔ پھر بولا۔ "مُجھے اکیلا نہ چھوڑنا۔ وہ۔۔۔۔"

"وہ؟ وہ کون؟" نامدار نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا؟ میں نے کسی کو بتا دیا تو وہ۔۔۔۔۔"

نامدار نے اُسے تسلّی دی اور کہا۔ "میں تمہارے پاس ٹھہروں گا۔ گھبراؤ نہیں۔" رشید علی نے آنکھیں بند کر لیں۔ نامدار کُچھ سوچنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ کہا۔ "رشید علی، سُنو۔" رشید علی نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"اِس وقت سات بجے ہیں۔ میں ساڑھے دس بجے سے پہلے تمہارے پاس آجاؤں گا، اور پھر رات تمہارے پاس ہی گزاروں گا۔"

"مگر اتنا عرصہ میں اکیلا۔۔۔؟"

"حوصلے سے کام لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساڑھے دس بجے تک یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

رشید علی کو اچھّی طرح تسلّی دے کر نامدار اُس کے کیبن سے باہر نکلا اور

ڈیوٹی نرس سے کہا۔ "میں رات کو مریض کے پاس ٹھہروں گا اور دس ساڑھے دس بجے تک آجاؤں گا۔"

"یہ اچھّا رہے گا۔ اس طرح مریض کو حوصلہ رہے گا۔"

"میری واپسی تک اس کا خیال رکھیں۔ کسی کو اس سے نہ ملنے دیں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ چوکی پہنچ کر اُس نے ہاشم خان سے اجازت لی۔ وہ اُسے رات اپنے ہاں ٹھہرانے پر اصرار کرنے لگا، لیکن وہ نہ رُکا۔ پھر وہ بوبی پر سوار ہوا۔ اِس بار واپسی کا سفر پہلے سے بھی تیزی سے ہوا۔ آٹھ بجے بوبی سکینہ کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ نامدار نے جلدی جلدی سکینہ کو بتایا کہ رشید علی کا پتا چل گیا ہے اور وہ اُس سے مل کر آرہا ہے۔ اُس نے سکینہ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ زخمی ہے اور ہسپتال میں پڑا ہے۔ صرف اتنا کہا

کہ اُس کو بخار ہے۔ اِس لیے وہ اپنے ایک جاننے والے کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک آدھ دِن تک واپس آ جائے گا۔ اس نے سکینہ سے کہا کہ وہ کل کسی وقت اُسے شہر لے چلے گا، اگرچہ اُس کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور رشید علی نے بھی منع کر رہا تھا۔ یوں سکینہ کو مطمئن کر کے وہ باہر نکلا۔

اپنے گھر پہنچ کر اُس نے کھانا کھایا اور کُچھ کپڑے اور دری اور تکیہ لیا اور رات باہر رہنے کا کہہ کر بوبی پر سوار ہو گیا۔

وہ ساڑھے نو بجے شہر کے اُس چائے خانے کے پاس کھڑا تھا جس کے باہر فٹ پاتھ پر، ایک بنچ پر شریف بیٹھا اپنے مزدُور ساتھیوں سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ نامدار کو دیکھ کر اُس کے پاس آ گیا۔

"رشید علی کا پتا چلا؟" شریف نے پوچھا۔

"ہاں، چل گیا ہے۔ میں تُم سے کُچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"کہیے۔" شریف بولا۔

"آڑھتی سراج دین کا گھر کہاں ہے؟"

"وہ نیوٹاؤن میں رہتا ہے۔ نئی کوٹھی بنوائی ہے۔ دو سال پہلے۔" شریف نے بتایا۔

"ہوں!" نامدار بولا۔ "کیا پہلے وہ فیض باغ رہتا تھا؟"

"فیض باغ؟" شریف بولا۔ "نہیں۔ پہلے وہ نُور محلے میں رہتا تھا۔"

"اچھا، میں چلتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔ "پھر مِلوں گا تُم سے۔"

"رشید علی گھر چلا گیا؟"

"کل پرسوں چلا جائے گا۔ اب اُس کی کوئی فِکر نہیں۔" نامدار بولا۔

جب بوبی نے ملنے کے لیے قدم آگے بڑھائے تو شریف تیزی سے بولا "ایک بات سُنتے جائیں۔ آڑھتی سراج دین کا ایک سالا ہے۔ وہ فیض باغ میں رہتا ہے۔"

نامدار جلدی سے بوبی سے نیچے اُتر آیا۔ ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور بولا۔ "وہ کیا کرتا ہے اور کیسا آدمی ہے؟"

شریف ہنس کر بولا۔ "اکبر اُس کا نام ہے۔ کہتے ہیں امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندا کرتا ہے۔ بڑا بدنام ہے۔"

"اُس کا کوئی دفتر بھی ہو گا۔" شریف پھر ہنسا اور بولا۔ "دفتر اُس کا کوئی نہیں

ہے۔ فیض باغ والے مکان پر ہی ایک بورڈ لگا رکھا ہے۔ میں کئی بار اُس کا گھر دیکھ چکا ہوں۔" پھر رُک کر بولا۔ "مگر آپ یہ سب کُچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

نامدار مُسکرایا اور بولا۔ "تُم نے ہی تو بتایا تھا کہ رشید علی اور سراج دین کا جھگڑا ہوا تھا؟"

"ہاں۔" شریف بولا۔ "لیکن اُس کا آڑھتی کے سالے سے کیا واسطہ؟"

"یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ اِس وقت جلدی ہے۔" یہ کہہ کر نامدار نے اُسے پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا اور بولا۔ "اپنے آڑھتی پر نظر رکھنا۔ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ رشید علی اور سراج دین کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا۔"

نامدار تھانیدار ہاشم خان کے پاس گیا تو وہ اُسے دیکھ کر کُچھ حیران ہوا۔ نامدار

نے ہنس کر کہا۔ "یہ رات میں رشید علی کے پاس گزارنا چاہتا ہوں۔ آپ کو بتا دیتا تو آپ مُجھے جانے نہ دیتے۔ مُجھے رشید علی کی بیوی کو بھی اُس کی خیریت کی اطلاع دینی تھی۔"

"میں کوئی سپاہی بھیج دیتا۔" تھانیدار ہاشم خان بولا۔

"یہی تو میں نہیں چاہتا تھا۔ سپاہی کو دیکھ کر وہ ڈر جاتی۔ پھر میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ اُسے قتل کیا جانے والا تھا اور وہ شدید زخمی ہے، بلکہ یہ کہا ہے کہ اُسے بخار آ گیا ہے جو اب اُتر رہا ہے۔ اور وہ ایک دو دِنوں میں گھر آ جائے گا۔"

"بڑے سمجھ دار ہو تُم۔"

"بوبی باہر کھڑا ہے۔" نامدار بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔"

"بس، میں سمجھ گیا۔ ابھی اِس کا انتظام کروا دیتا ہوں، اور تمہارے کھانے کا بھی۔"

"کھانا میں کھا کر آیا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

ہاشم خان نے ایک سپاہی کو بوبی کے بارے میں حُکم دیا، پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نامدار سے کہا "رشید علی واردات کے بارے میں کُچھ بتائے تو مُجھ سے چھُپانے کی کوشش نہ کرنا۔

پُراسرار آدمی

رشید علی نامدار کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ نامدار نے اُس سے نرمی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "میں گھر سے ہو کر آیا ہوں۔ تمہاری بیوی کو تسلّی دے دی ہے۔ بے فکری سے آرام کرو تاکہ تمہارا زخم جلدی ٹھیک ہو اور تُم گھر جا سکو۔"

نامدار نے اُس کے بستر کے سامنے اپنی دری بچھائی، پھر اُس پر چادر بچھا کر

تکیہ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ بہت اچھے ہیں، اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود۔۔۔۔۔۔"

"بس بس۔" نامدار نے کہا۔ "زیادہ باتیں نہ کرو۔ سو جاؤ۔۔۔۔ آرام کرو۔"

نامدار اپنے ساتھ ایک کتاب لے آیا تھا۔ وہ بستر پر تکیے کا سہارا لے کہ کتاب پڑھنے لگا۔ رشید علی اُسے کبھی کبھار دیکھ لیتا۔ پھر وہ سو گیا۔

ایمرجنسی وارڈ کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مریض جو رات کے پہلے حصّے میں کراہتے رہے تھے، وہ بھی اب سو چکے تھے۔ نامدار کتاب پڑھتا رہا۔ جب اُس پر غنودگی کا غلبہ ہوا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کروٹ بدل کر رشید علی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ یقیناً

رشید علی اُن لوگوں کو جانتا ہو گا۔ اُس کا اچانک شہر آنا بھی بے مقصد نہ تھا۔ آڑھتی سراج دین سے اُس کا جھگڑا ہوا۔ واردات فیض باغ میں ہوئی جہاں سراج دین کا سالا اکبر رہتا ہے اور جس کی شہرت اچھّی نہیں۔ آخر کیا ماجرا ہے؟ سب سے زیادہ پریشانی نامدار کو اِس بات کی تھی کہ رشید علی بہت خوف زدہ تھا۔ وہ اپنے دُشمنوں یا دُشمن کا نام بھی بتانے کے لیے تیّار نہ تھا۔ اُس کے دِل پر اُن کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ وہ دیر تک یہی باتیں سوچتا رہا، اور ذہن پر زور دیتا رہا کہ کوئی ایسا سُراغ مِل جائے جس سے وہ رشید علی کے دُشمنوں تک پہنچ سکے۔

اچانک سرگوشیوں کی آواز سُن کر وہ چوکنّا ہو گیا۔ کیبن کے دروازے کے بالکل پاس کوئی بول رہا تھا، آہستہ آہستہ۔۔۔ پھر قدموں کی آواز سُنائی دی، مدّھم سی چاپ۔ نامدار کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔ ایک شخص کیبن کے

اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک ہلکی چادر سے مُنہ چھُپا رکھا تھا۔ وہ کیبن کے پاس آ کر ٹھِٹھکا۔ وہ کبھی اُسے دیکھتا تھا اور کبھی رشد علی کو۔

نامدار نے اُس شخص کا چہرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن دیکھ نہ سکا۔ وہ پُراسرار آدمی جس طرح دبے قدموں آیا تھا، اُسی طرح آواز پیدا کیے بغیر اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔

نامدار کے دِل میں کھُد بُد ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور کیبن سے باہر نکلا۔ ایمرجنسی وارڈ میں کوئی اجنبی دِکھائی نہ دے رہا تھا۔ ڈیوٹی نرس کرسی پر بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ نامدار کو دیکھ کر وہ چونکی۔ نامدار اُسے سلام کر کے وارڈ سے باہر نکل گیا۔

ہسپتال کے برآمدے میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ چند منٹ وہاں کھڑا رہا، پھر

واپس وارڈ میں آگیا اور ڈیوٹی نرس سے آہستہ سے پوچھا :

"ابھی ایک آدمی یہاں آیا تھا۔ وہ کون تھا؟"

نرس نے آنکھیں جھپکائیں اور بولی۔ "آپ کے مریض کا رشتے دار تھا۔"

"مگر اتنی رات گئے؟" نامدار بولا۔

"میں خود حیران ہوئی کہ اِس وقت وہ کیسے اندر آگیا۔ میں نے اُسے سمجھایا تو وہ بولا کہ میں اُس کا رشتے دار ہوں۔ بس ایک نظر دیکھنے دو"

"آپ نے اُسے میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "اتنا موقع ہی نہیں ملا۔"

"اُس نے کچھ اور بھی کہا تھا؟"

"نہیں۔ اُس نے میری منّت کی تھی کہ میں چند لمحوں کے لیے اُسے مریض کے پاس جانے دوں۔"

نامدار نے کہا۔ "اب کوئی مریض سے ملنے آئے تو اُسے بتا دیں کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور ایک شخص مریض کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس موجود ہے۔"

"میں کہہ دوں گی۔"

"شکریہ۔" نامدار نے کہا۔

رشید علی کے پاس آ کر نامدار اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ بار بار اُس کے دِل میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔ "وہ آدمی، وہ پُراسرار آدمی کون تھا؟"

"ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" رشید علی کی آواز سُن کر نامدار چونکا اور پھر

مُسکرا کر بولا۔ "ابھی آنکھ کھُلی ہے۔"

"مُجھے تو یوں لگتا ہے کہ آپ سوئے ہی نہیں۔ آنکھیں بتا رہی ہیں۔"

نامدار نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "کہو، اب کیسی طبعیت ہے؟"

"اب بہتر ہوں۔" رشید علی بولا۔ "آپ کا سہارا جو مل گیا۔"

"اور سو لو۔ ابھی رات باقی ہے۔" نامدار نے کہا۔

"کیا وقت ہو گا؟"

نامدار نے کلائی پر بندھی گھڑی کر دیکھا اور بولا۔ "سوا چار بجے ہیں۔"

پھر تو صُبح ہونے والی ہے۔"

ایمرجنسی وارڈ میں اب کُچھ آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں۔ دونوں خاموش

تھے۔ نامدار اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ رشید علی کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں صاف دِکھائی دے رہی تھیں۔ نامدار اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، رشید علی؟"

"کُچھ نہیں۔"

نامدار مُسکرایا اور بولا۔ "لگتا ہے تم مُجھے اعتماد کے قابل نہیں سمجھتے۔"

"ایسا نہ کہو۔ آپ کے تو ہم پر بڑے احسان ہیں۔ پھر اب۔۔۔۔"

"احسانوں کی بات چھوڑو۔" نامدار بولا۔ "سچ سچ بتاؤ، کیا تُم مُجھ سے کُچھ چھُپانے کی کوشش نہیں کر رہے؟"

رشید علی جواب دینے سے پہلے کُچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ پھر بولا۔ "ہاں، لیکن میں مجبور ہوں۔"

"کیا مجبوری ہے؟" خوف کا سایہ رشید علی کے چہرے پر منڈلانے لگا۔ نامدار بولا۔ "رشید علی، میں تمہاری ہر مجبوری دُور کر سکتا ہوں۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ مُجھ سے کُچھ نہ چھپاؤ۔ تُم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ میں تمہارے دُشمنوں کو اُن کے انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"وہ بہت طاقت ور ہیں۔"

"قانون سے زیادہ بھلا کون طاقت ور ہو سکتا ہے۔" نامدار نے کہا، "مُجھے تُم اگر سب کُچھ بتانا نہیں چاہتے تو صرف ایک بات بتا دو کہ وہ کون ہے؟"

رشید علی خاموش رہا۔

"اگر تُم مُجھے کُچھ بتانے کے لیے تیّار نہیں تو سُنو۔ میں جانتا ہوں۔"

"آپ کُچھ نہیں جانتے۔" رشید علی نے کہا۔

نامدار نے کُچھ سوچا، پھر بولا۔ "سُنو۔ جس دِن تُم شہر آئے تھے، اُسی روز تمہارا اور آڑھتی سراج دین کا جھگڑا ہوا تھا۔ اُس نے تمہیں دُکان سے نِکل جانے کے لیے کہا تھا۔ تمہاری بے عزّتی کی تھی۔ تُم نے اُسے دھمکی دی۔ اُس نے جواب میں تمہیں دھمکی دی۔ اور اُسی رات تُم پر حملہ ہوا۔ گولی چلی۔"

رشید علی کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ خاموش رہے یا سب کُچھ بتا دے۔

"بولو، کیا ایسا نہیں ہوا؟" "ہوا تھا۔" رشید علی نے جواب دیا۔

"پھر تُم کب تک حقیقت کو مُجھ سے چھُپاتے رہو گے اور اپنے دُشمنوں سے ڈرتے رہو گے؟"

رشید علی پھر چُپ ہو گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ایک بات اور سُنو۔" نامدار بولا۔ "فیض باغ میں اکبر رہتا ہے، جو آڑھتی سراج دین کی بیوی کا بھائی ہے۔"

نامدار نے دیکھا کہ رشید علی کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ بولا۔ "آپ بہت کُچھ جاننے کے باوجود کُچھ نہیں جانتے۔"

"اگر میں نہیں جانتا تو جان لوں گا کہ وہ کون ہیں جنھوں نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ تمھیں میری مدد کرنی چاہیے، مُجھے سب کُچھ بتا دینا چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے ہر طرح کے خوف اور خطرے سے آزاد ہو جاؤ۔"

"میں مجبور ہوں۔" رشید علی کے لہجے میں بے بسی رچی ہوئی تھی۔

"اچھّا تو پھر اپنی مجبوری ہی بتا دو۔" نامدار نے کہا۔ رشید علی آنکھیں بند کر کے بولنے لگا۔ "وہ جو بھی ہیں، میں نہیں چاہتا کہ وہ میری وجہ سے کسی دُوسرے کو نقصان پہنچائیں۔ میں ایک بار اُن کا نشانہ بن چُکا ہوں، اور وہ پھر مُجھے ختم کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن پہلے میں بے خبر تھا۔ اب نہیں ہوں۔ میں اپنی حفاظت کروں گا۔ چوکنّا رہوں گا۔ پھر یہ کہ میرے پاس ایک ایسا راز ہے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں گا اور اپنے دُشمنوں سے نمٹ لوں گا۔ اگر میں نے کسی کو اِس راز میں شریک کیا تو میں جہاں اُن سے خود پوری طرح نمٹ نہ سکوں گا، وہاں وہ اُس شخص کو بھی نقصان پہنچائیں گے جو اِس راز سے آگاہ ہو گا۔"

نامدار ایک سیکنڈ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "رشید علی تُم اُن کے راز سے واقف ہو، اِس لیے وہ تمھیں زندہ دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ پھر تُم خود کہتے ہو کہ

وہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔ ایسی صورت میں اُن کا مقابلہ کیسے کر سکو گے؟"

رشید علی نے آنکھیں کھول دیں اور بڑی بے چارگی سے بولا۔ "مُمکن ہے آپ کی بات صحیح ہو۔ لیکن میں ابھی کسی کو کُچھ نہیں بتا سکتا۔"

"صُبح تھانیدار تمہارا بیان لینے کے لیے آئے گا۔ اُسے کیا بتاؤ گے؟"

"یہی کہ مُجھے کُچھ معلوم نہیں کہ مُجھ پر کس نے گولی چلائی۔"

"تمہارا کوئی رشتے دار ہو تو بتا دو تاکہ اُسے خبر کر دوں۔"

رشید علی اداسی سے مُسکرایا اور بولا۔ "میرا بیوی اور بچّی کے سوا اور کوئی نہیں۔ آپ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ میرا اِس دُنیا میں کوئی رشتے دار نہیں۔"

"اچھّا تو پھر سُن لو۔" نامدار بولا۔ "گزشتہ رات دو بجے ایک شخص اپنے آپ کو تمہارا رشتے دار بتا کر تمہیں دیکھنے آیا تھا۔"

"کون تھا وہ؟" رشید علی کی آواز میں بے چینی اور پریشانی تھی۔

"جب تُم کُچھ بتانے کے لیے تیّار ہی نہیں تو میں کیوں بتاؤں کہ وہ کون تھا۔"

اس سے پہلے کہ رشید علی کوئی جواب دیتا، ایک ڈاکٹر اور نرس کمرے میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے رشید علی کا معائنہ کیا۔ پھر ڈاکٹر نے نامدار سے کہا۔ "بس اب زخم بھرنے اور کمزوری دور ہونے کی بات ہے۔ ہم چند دِنوں میں اِسے ہسپتال سے فارغ کر دیں گے۔"

نامدار نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر بولا۔ "رشید علی، تھانیدار ہاشم خان

تمہارا بیان لینے کے لیے آ رہا ہے ۔ میرا خیال ہے اب تُم اِس حالت میں ہو کہ اُسے تُم سے ملنے کی اجازت دے دی جائے ۔"

تھانیدار ہاشم خان کے لیے کیبن میں ایک کُرسی رکھ دی گئ ۔ اُس کا ایک نائب نامدار کے پاس بستر پر بیٹھ گیا ۔ ہاشم خان تھانیدار نے رشید علی سے کہا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر اور صیح بیان لکھوائے ۔ پہلے رشید علی کا نام، ولدیت ، عمر ، ذات اور پتا لکھا گیا ۔ اِس کے بعد اُس نے بیان لکھوانا شروع کیا ۔

اُس نے بتایا کہ وہ کُچھ گھریلو ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے شہر آیا تھا ۔ اُس نے وہ چیزیں ، جو چالیس پچاس روپے کی تھیں ، خرید کر گھر جانے کی بجائے شہر میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ گرمی بہت تھی ، اِس لیے وہ ٹہلتے ہوئے شہر کے کمپنی باغ میں چلا گیا ، جہاں وہ دیر تک ٹہلتا رہا ۔ اِس کے بعد

اُس نے ایک ہوٹل سے کھانا کھایا اور پھر رات فیض باغ کی ایک سرائے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ فیض باغ کے علاقے میں پہنچا تو رات خاصی بیت چُکی تھی۔ وہ فیض باغ کے چوک میں سے گُزر رہا تھا کہ کسی نے اُس پر گولی چلائی۔ وہ بے ہوش ہو کر گِر پڑا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔

"جب تُم شہر آئے تو تمہارے پاس کتنی رقم تھی؟"

"دو سو روپے تھے۔ کُچھ کرائے پر خرچ ہوا۔ سامان خریدا اور پھر کھانا کھایا۔ سو سوا سو روپیہ رات کو میری جیب میں تھا۔"

"تُم نے جو سامان خریدا تھا وہ کہاں گیا؟"

"اُس وقت جب مُجھ پر گولی چلی، میرے پاس تھا۔ اِس کے بعد اُسے کون

لے گیا، مُجھے کُچھ معلوم نہیں۔" رشید علی نے جواب دیا۔

"تمہارا کوئی دُشمن، کوئی ایسا شخص جس کا تمہیں کُچھ دینا ہو؟ کسی سے کبھی لڑائی ہوئی ہو؟ آخر کِسی نے تُم پر گولی کیوں چلائی؟"

"میرا کوئی دُشمن نہیں۔ کسی سے کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ نہ لین دین کا کوئی معاملہ ہے۔"

تھانیدار ہاشم خان نے نامدار کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "اس طرح تُم پر گولی چلانے والے کا سُراغ کیسے ملے گا۔"

رشید علی چُپ رہا۔ تھانیدار نے نامدار سے کہا۔ "یہ کیا قصّہ ہے؟ اِس طرح تو تفتیش آگے نہیں بڑھ سکے گی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ رشید علی کہتا ہے کہ اُسے کسی پر شُبہ نہیں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ایسے کیس وقت آنے پر داخل دفتر کر دیے جاتے ہیں۔"

ایک ڈیڑھ گھنٹا سر کھپانے کے بعد تھانیدار چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد نامدار نے رشید علی کہا۔ "تُم نے اچھّا نہیں کیا۔ تُم شاید یہ بھول گئے کہ کِسی جرم کے بارے میں معلومات چھُپانا بھی ایک جُرم ہے۔" رشید علی خاموش تھا۔ نامدار نے بھی کافی دیر تک کوئی بات نہ کی۔

"اب میں بھی گھر جاؤں گا۔" نامدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں۔۔۔۔ اکیلا؟" رشید علی گھبرا کر بولا۔

"تُم یہاں اکیلے نہیں ہو۔ یہاں، اِس وارڈ میں، بیسیوں مریض ہیں۔ اگر اتنے ہی خوف زدہ ہو تو پھر بتا کیوں نہیں دیتے؟"

رشید علی نے ہاتھ جوڑ کر نامدار سے کہا۔ "مُجھے یہاں سے گھر لے چلیں۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" نامدار بولا۔ "جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دیں تمہیں یہاں سے لے جایا نہیں جا سکتا۔"

"مگر وہ پھر آئیں گے۔ میری جان کو خطرہ ہے۔"

"اگر تمہاری جان کو خطرہ ہوتا۔" نامدار نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو تُم نے نہ مُجھ سے کُچھ چھپاتے اور نہ تھانیدار سے جھوٹ بولتے۔"

رشید علی کے چہرے پر بے بسی چھا گئی۔ نامدار کو اُس پر ترس آ گیا۔ وہ بولا۔ "اچھّا، اب مُجھے جانے دو۔ شام کو آ جاؤں گا۔ اور ہاں، تمہاری بیوی کو ساتھ لیتا آؤں؟"

"نہیں، نہیں۔ اُسے نہ لانا۔" رشید علی بولا۔ "بس اُسے تسلّی دے دینا۔"

”جیسی تمہاری مرضی۔“

یہ کیا ہوا!

ہسپتال میں چار بجے مریضوں کے عزیز رشتے دار تیمار دار اور مہمان آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ملاقات کے اِن اوقات میں ہسپتال کے ہر وارڈ میں بہت رش ہوتا ہے۔ عموماً نرسیں اور ڈاکٹر بھی اِس وقت وارڈ میں نہیں آتے۔

ٹھیک سوا چار بجے ایک اُدھیڑ عمر کا شخص جس نے ڈاکٹروں کا ہاؤس کوٹ

پہن رکھا تھا، ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوا۔ مریضوں اور اُن کے تیمار داروں نے اُس پر زیادہ توجّہ نہ دی۔ ڈاکٹر بے نیازی سے چلتا ہوا وارڈ کے اُس کیبن میں داخل ہو گیا جسے پارٹیشن کر کے بنایا گیا تھا اور جس میں رشید علی کو رکھا گیا تھا۔ رشید علی اُس وقت جاگ رہا تھا۔ ڈاکٹر اُسے دیکھ کر مُسکرایا اور بولا۔ "میں تمہارا معائینہ کرنے آیا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اُس کی نبض ٹٹولی، پھر آلہ لگا کر سینے کا معائینہ کیا۔ اُس کے بعد بولا۔ "تُم ٹھیک ہو رہے ہو۔ لیکن خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری بہت ہے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولا۔ "تمہارے طاقت کا ٹیکا لگے گا۔"

اُس نے جیب سے ایک سرنج اور ٹیکا نکالا اور رشید علی کی قمیص کی آستین اُلٹ کر اُس کے بازُو میں ٹیکا لگا دیا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ اُس نے رشید علی کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی مُسکرایا اور پھر بولا۔ "آرام کرو۔ جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔"

وہ کیبن سے نکل کر، وارڈ سے گُزرتا ہوا، اسپتال کے برآمدے میں پہنچا۔ برآمدے سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کے پاس جا کر اُس نے کوٹ اُتار کر ہاتھ میں لے لیا اور تیز تیز سیڑھیاں اُتر کر ہسپتال کی نچلی منزل پر پہنچا۔ وہاں سے بڑے دروازے کو عُبُور کرتے ہسپتال کے باہر چلا گیا۔

رشید علی نے ٹیکا لگنے کے چند منٹ بعد محسوس کیا کہ اُس کا سانس گھُٹ رہا

ہے۔ اُس نے سانس لینے کے لیے پورا مُنہ کھول دیا، لیکن سانس گھُٹتا ہی چلا گیا۔ اُس نے چیخنے کے لیے آواز نکالی چاہی تو اُس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ خوف سے اُس کا سارا وجود کانپنے لگا۔ پسینے سے جسم بھیگنے لگا اور مُنہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں اور پھر وہ آخری بار تڑپا اور مر گیا!

سوا چھ بجے، جب تمام ملاقاتی جا چکے تھے، ڈیوٹی نرس وارڈ میں داخل ہُوئی۔ اُس نے مریضوں پر نظر ڈالی۔ پھر اُن کا ٹمپریچر دیکھنے لگی۔ پونے سات بجے وہ رشید علی کے کیبن میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف دکھائی دینے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا اور آگے بڑھ کر رشید علی کی نبض ٹٹولی۔ وہ مرا ہوا تھا۔

ڈاکٹروں کے لیے یہ موت بے حد حیران کُن تھی۔ فوری طور پر پولیس کو

اطلاع دے دی گئی۔ دیگر ضروری کاروائیاں بھی کر لی گئیں۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے ہدایت کی تھی کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ فوراً اُسے پیش کی جائے۔ رشید علی کے چارٹ کا معائینہ کئی ڈاکٹروں نے کیا۔ اُس کی حالت سنبھل رہی تھی۔ پھر وہ کیسے مر گیا!

*****

نامدار پہلے سکینہ کے گھر پہنچا۔ اُسے رشید علی کے بارے میں تسلّی دی۔ کُچھ روپے بھی دیے۔ اُسے اچھّی طرح مطمئن کر کے جب وہ چلنے لگا تو بولا۔ "شام کو میں پھر جاؤں گا اور کل آ کر تمہیں بتاؤں گا۔"

وہ اپنے گھر پہنچا اور غُسل کیا۔ اُس کے بعد کھانا کھایا اور پھر لمبی تان کر سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو شام ہونے والی تھی۔ وہ اُٹھا غسل کیا، لباس

بدلا، اصطبل میں گیا، بوبی کو دیکھا، اُس سے باتیں کیں۔ اور پھر بوبی پر سوار ہو کر شہر روانہ ہو گیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رشید علی، جِس کے پاس رات گزارنے وہ شہر جا رہا ہے، مر چُکا ہے۔

شریف مزدُور چائے خانے میں تھا۔ نامدار کو دیکھ کر اُس کی باچھیں کھِل گئیں۔

"کہو، کُچھ کام بنا؟" نامدار نے کہا۔

شریف بولا۔ "ایک بات دیکھی ہے، انوکھی۔"

"جلدی بتاؤ۔"

"آج میں نے اپنے آڑھتی سراج دین کو بہت پریشان دیکھا۔"

"کُچھ وجہ معلوم ہوئی؟"

"وجہ ہم مزدوروں کو کون بتاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

"ایک بات یاد آ گئی۔" شریف بولا۔ "دنیا بڑے فیشن کرنے لگی ہے۔"

"ہوا کیا؟" نامدار نے کہا۔

"وہ جی، منڈی کے پاس ایک پھٹیچر سا کمپونڈر ہے۔ اُس نے اپنی دُکان کھول رکھتی ہے۔ اُسے جب دیکھا، شلوار قمیص میں دیکھا۔ آج اُس کا حُلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔"

نامدار کو اِس بات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن شریف اپنی بات اُسے سُنانے پر تُلا ہوا تھا۔

"آج میں نے اُسے کوٹ پتلون پہنے دیکھا تو اُس کا بڑا مذاق اُڑایا۔ وہ کہنے لگا کہ تُم اِس لباس کو اتنا ہی ناپسند کرتے ہو تو میں اِسے ابھی اُتار دیتا ہوں۔ پھر کبھی نہیں پہنوں گا۔ میں دو تین گھنٹے بعد اُدھر سے گزرا تو کمپونڈر صاحب نے پتلون اُتار دی تھی اور شلوار قمیص پہن لی تھی۔"

نامدار نے گھڑی دیکھی اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر شریف کو دیا۔

"آپ مُجھے اتنے پیسے دے رہے ہیں۔ میں آپ کے کسی کام تو آ نہیں رہا۔ اب مُجھے شرم آنے لگی ہے۔"

"کسی نہ کسی دِن کام آ جاؤ گے۔" نامدار بولا۔ "بس تُم ذرا آنکھیں اور کان کھُلے رکھو۔ اپنے آڑھتی پر نظر رکھو۔"

پولیس چوکی میں تھانیدار ہاشم خان موجود نہیں تھا۔ ایک سپاہی نے بوبی کی لگام پکڑی اور اُسے باندھنے کے لیے لے گیا۔

نامدار نے کہا۔ "تھانیدار صاحب سے کہنا، میں ہسپتال میں ہوں۔"

وہ اپنا بیگ اُٹھائے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوا اور اُس نے ڈیوٹی نرس کو سلام کیا تو اُس نے جواب دینے کی بجائے کہا۔ "ذرا رُکیے۔"

نامدار رُک گیا۔ نرس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ نرس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کا مریض مر چُکا ہے؟"

نامدار کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں، آپ؟" اُس نے اُونچی آواز میں پوچھا۔

"آہستہ بات کیجیے۔" نرس بولی۔ "رشید علی مر گیا ہے۔"

"مگر کیسے؟ وہ تو اچھّا خاصا تھا۔"

"یہی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔" نرس بولی۔

"مگر۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟ کیسے۔۔۔۔؟" نامدار کو کوئی بات نہ سُوجھ رہی تھی۔

"لاش کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔" نرس نے بتایا۔

"مگر۔۔۔ رشید علی۔۔۔۔ میں سکینہ کو کیا بتاؤں گا؟" نامدار کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

آپ پولیس چوکی چلے جائیں یا میڈیکل سپر نٹنڈنٹ سے ملیں۔" نرس نے مشورہ دیا۔

بوجھل قدموں اور بوجھل دِل کے ساتھ نامدار ایمرجنسی وارڈ سے نکلا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ سکینہ کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے بار بار آ رہا تھا۔ وہ سیدھا پولیس چوکی پہنچا۔ تھانیدار ابھی تک نہ آیا تھا۔ چند منٹ انتظار کر کے وہ پھر ہسپتال کے اندر داخل ہوا اور میڈیکل سپر نٹنڈنٹ کے کمرے میں اپنی چِٹ بھجوائی۔ اُسے اندر بُلا لیا گیا۔

نامدار نے اپنا تعارف کرایا اور رشید علی کا حوالہ دیا۔

"افسوس! وہ مر چُکا ہے۔"

مگر کیسے؟"

"میں خود حیران ہوں۔ ڈاکٹر بھی پریشان ہیں۔ لیکن اُس کا پتا ایک دو گھنٹے تک چل جائے گا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔" نامدار دفتر سے باہر نکل آیا۔

نوٹوں کی گڈّیاں

نامدار پولیس چوکی میں جا کر تھانیدار ہاشم خان کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ہاشم خان اندر داخل ہوا۔ نامدار کو دیکھ کر بولا :

"تم نے سُن لیا ہوگا کہ ۔۔۔۔"

"ہاں، میں سُن چکا ہوں۔ مگر یہ کیسے ہوا؟"

ہاشم خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اپنی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"پوسٹ مارٹم۔۔۔" نامدار نے کُچھ کہنا چاہا لیکن رُک گیا۔

"ہاں۔۔۔ رپورٹ جلد ہی مل جائے گی۔" ہاشم خان بولا۔ "اُس نے تمہیں کُچھ تو بتایا ہو گا، پچھلی بات؟"

"وہ کُچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔" نامدار بولا۔ "اُس نے آج صُبح آپ کو جو بیان لکھوایا وہ بھی جھوٹا تھا۔"

"مُجھے اُس کا پہلے ہی یقین تھا۔"

"وہ اپنے دُشمنوں کو جانتا تھا، لیکن اُن کے بارے میں کُچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر کیوں؟"

"اُس کی کُچھ وجوہات اُس نے بتائی تھیں۔ وہ اپنے دُشمنوں کے کسی بڑے راز سے واقف تھا۔"

"اوہ! اب کیا ہوگا؟ معاملہ زیادہ اُلجھ گیا ہے۔" نامدار خاموش رہا تو ہاشم خان نے پوچھا۔ "کُچھ کھاؤ گے؟ چائے منگواؤں؟"

نامدار نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا، اور خاموش بیٹھا رہا۔ تھانیدار ہاشم خان اپنے کام میں لگ گیا۔

ساڑھے بارہ بجے رات کو تھانیدار ہاشم خان نے کہا۔ "آؤ، ہسپتال چلیں۔ مُجھے بھی اپنی کارروائی کرنی ہے۔"

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر اُس وقت موجود تھے۔ وہ

اُن کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے تھانیدار سے کہا۔
"لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کرنے کا انتظام کردیں۔"

نامدار نے کہا۔ "اس کی وارث تو اُس کی بیوی ہے اور ایک چھوٹی بچّی۔ میں اُسی قصبے کا ہوں، کیا مُجھے۔۔۔"

"ہاں، ضمانت پر لاش تمہارے سپرد کردی جائے گی۔"

ہاشم خان نے کہا۔ "میں اِس کا انتظام کرتا ہوں۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر پریشانی تھی۔

نامدار نے پوچھا۔ "آپ موت کی وجہ بتا سکیں گے؟"

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے پاس بیٹھے ڈاکٹروں کی طرف دیکھا تو ایک ڈاکٹر بولا۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کھنکھار کر بولا۔ "معاملہ بہت نازک ہے۔ میں اِس کی اطلاع آئی جی صاحب کو دے چُکا ہوں۔"

تھانیدار ہاشم خان چوکنّا ہو گیا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "اِس معاملے کی تفتیش کے لیے سپیشل سٹاف کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ آپ کا کام ختم ہو چکا ہے۔ آپ لاش اُس کے رشتے داروں کے حوالے کر دیں۔"

یہ گویا اشارہ تھا کہ تھانیدار ہاشم خان جا سکتا ہے۔ ہاشم خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن نامدار بیٹھا رہا۔

"آپ چلیں۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کُچھ باتیں کر کے ابھی آتا ہوں۔"

میڈیکل سپر نٹنڈنٹ نے نامدار کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "مُجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کُچھ نہیں بتا سکتا۔" نامدار نے اپنا تعارف کرایا اور بولا۔ "میں ذمّے دار آدمی ہوں۔ میری دِلچسپی کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں، میں تمھارے بارے میں بہت کُچھ چکا ہوں۔ لیکن تمھیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"میں آپ کی توقّع پر پورا اُتروں گا۔" نامدار نے کہا۔

میڈیکل سپر نٹنڈنٹ نے دوسرے ڈاکٹروں کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "وعدہ کیجیے کہ جب تک آپ کو اجازت نہ دی جائے، آپ اِس راز کا انکشاف نہیں کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

"معاملہ ایسا ہے کہ کسی کو خبر ہو گئی تو ہسپتال کی نیک نامی پر بُرا اثر پڑے گا۔"

نامدار نے محسوس کیا کہ اُس کے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"رشید علی کو قتل کیا گیا ہے۔"

"قتل؟ ہسپتال میں قتل؟" نامدار نے حیرت سے کہا۔

"کسی نے اُسے زہر کا ٹیکا لگا دیا اور وہ مر گیا۔" نامدار کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "ہم نے اپنے طور پر وہ تحقیقات کی ہے، اُس سے ایک بات سامنے آتی ہے جو میں نے آئی جی صاحب کو بتا دی ہے۔"

نامدار دونوں آنکھیں پھاڑے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ایک جس نے ڈاکٹروں جیسا ہاؤس کوٹ پہن رکھا تھا، رشید علی کے کیبن میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ موت سوا چار بجے سے ساڑھے چار بجے کے درمیان ہوئی۔ اِسی دوران میں وہ ڈاکٹر مریض کے کیبن میں جاتے دیکھا گیا تھا۔"

"وہ کون تھا؟"

"کوئی جعلی ڈاکٹر تھا۔"

"اوہ! میرے خُدا!" بے اختیار نامدار کے مُنہ سے نکلا۔ اُسے وہ پُراسرار آدمی یاد آگیا جو پچھلی رات کیبن کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کس نازک پوزیشن میں گھِر گئے ہیں۔" میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "اسی لیے آپ سے رازداری کا وعدہ لیا گیا

ہے۔ مُجھے جو کُچھ معلوم تھا، میں نے آپ کو بتا دیا۔"

تھانیدار ہاشم خان خود لاش کے ساتھ ایمبولینس میں سوار ہُوا۔ نامدار بوبی پر سوار تھا۔ جب وہ قصبے کی حدود میں پہنچے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

چند منٹوں میں سارا گاؤں جاگ گیا اور ہر طرف کُہرام بپا ہو گیا۔ نامدار بوبی کو اپنے گھر چھوڑ کر واپس آ گیا۔ سکینہ کے بَین دِل ہلا رہے تھے۔ تھانیدار ہاشم خان نے اُونچی آواز میں لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"رشید علی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اُسے گولی لگی تھی۔ وہ ہسپتال میں مر گیا۔ ہم قاتل کو تلاش کر کے اُس کو سزا دِلوا کر رہیں گے۔"

صُبح دس بجے کے قریب رشید علی کو دفنا دیا گیا۔ سارے گاؤں کے مرد جنازے میں شریک ہوئے۔ سارے گاؤں کو اُس کی موت کا عِلم تھا۔

نامدار نے سکینہ کو تسلّی دی کہ خُدا کی مرضی کے سامنے کسی کی کُچھ نہیں چلتی۔ اب وہ صبر سے کام لے۔ اپنی بچّی کا خیال کرے۔ شام تک نامدار رشید علی کے گھر رہا۔ پھر وہ اپنے گھر چلا گیا۔

رشید علی کی موت ایک معمّا بن گئی تھی۔ نامدار کے ذہن میں سوالوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ رشید علی کے قاتل کو سزا دِلوانے کا پُختہ اِرادہ کر چکا تھا۔ وہ رات اُس نے کروٹیں بدلتے گزاری۔ کُچھ منصوبے بنائے، اور اُن منصوبے پر عمل کرنے کا پروگرام بھی طے کرلیا۔

صُبح وہ ساڑھے آٹھ بجے سکینہ کے گھر پہنچا۔ عورتیں رو رہی تھیں، لیکن ہجوم کم ہو چُکا تھا۔ ایک دو گھنٹے وہاں ٹھہر کر وہ پھر اپنے گھر آگیا۔ شام کو جب وہ دوبارہ سکینہ کے گھر گیا تو ہجوم چھٹ چکا تھا۔ نامدار کو دیکھ کر سکینہ نے روتے ہوئے کہا:

"مُجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"کہو!" نامدار نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ دو ایک گھنٹے بعد آئیں۔"

"اچھّا، میں رات کو آؤں گا۔" نامدار نے کہا۔

جب وہ دس بجے کے قریب سکینہ کے گھر گیا تو وہ اکیلی تھی۔ ایک کمرے میں اُس کی بیٹی اور کُچھ عورتیں سو رہی تھیں۔ وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ نامدار نے محسُوس کیا کہ وہ بوکھلائی ہوئی ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کِس طرح بات شروع کرے۔ آخر اُس نے روتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

"کل رات میں اپنے شوہر کی نشانیاں دیکھ رہی تھی۔ ایک صندُوق کو، جو وہ

پچھلے مہینے شہر سے خرید کر لایا تھا، دیکھا تو اُس میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اُس کی چابی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ ملی تو تالا توڑ دیا۔ صندُوق کھولا تو پریشان ہو گئی۔"

"کیا تھا اُس صندوق میں؟"

"آپ خود دیکھ لیں۔۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ ایک چھوٹا سا جستی صندُوق لائی۔ نامدار نے اُس کا ڈھکنا اُٹھایا۔ صندُوق کے اندر سو سو روپے کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نامدار کا سر چکرا گیا۔ رشید علی معمولی دُکان دار تھا۔ اِتنا روپیہ اُس کے پاس کہاں سے آ گیا:

"کیا اُس نے کبھی تُم سے اِن روپوں کا ذکر کیا تھا؟"

"کبھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ پھر بولی۔ "کتنے روپے ہوں

گئے؟" نامدار گڈّیاں اُٹھا کر گِننے لگا۔ جب وہ گِنتی مکمّل کر چُکا تو بولا۔ "تین لاکھ روپے ہیں۔"

"تین لاکھ۔" سکینہ کے مُنہ سے نکلا۔

نامدار نے صنُدوق بند کر دیا اور بولا۔ "کسی کو اِس بارے میں بتایا تو نہیں؟"

"نہیں۔ بس آپ کو اپنا جان کر بتا دیا ہے۔" سکینہ بولی۔

"کسی کو اِس کی بھنک نہ پڑنے دینا۔ اِس رقم کو صنُدوق سے نکال کر کسی محفوظ جگہ چھپا دو۔"

"مگر میں اتنا روپیہ کیا کروں گی؟" وہ بولی۔

"ابھی اِس بات کو چھوڑو۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔" نامدار نے کہا۔

"تُم میری باتوں پر عمل کرو۔ میں کل شہر جا رہا ہوں۔"

"اب شہر جا کر کیا کریں گے؟ مرنے والا تو مر گیا۔" سکینہ نے اُداس لہجے میں کہا۔

"ہاں، رشید علی تو مر گیا۔" نامدار بولا۔ "لیکن ابھی اُس کے قاتل زندہ ہیں، اور مُجھے اُن کا سُراغ لگانا ہے۔"

کاروبار

نامدار شہر میں آیا تو اس بار بوبی اُس کے ساتھ نہ تھا۔ وہ بس کے ذریعے شہر پہنچا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے منڈی کے قریب چائے خانے کا رُخ کیا۔ اُس وقت شریف وہاں موجود نہ تھا۔ اُس نے چائے بنانے کے ایک لڑکے سے کہا کہ شریف جا کر کہہ دے کہ اُس کا گاؤں والا دوست اُس سے ملنے آیا ہے۔

تھوڑی دیر میں شریف آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد نامدار نے پوچھا۔ "کہو، تمہارے آڑھتی کا مزاج کیسا ہے؟"

"کل سے وہ خُوش دِکھائی دے رہا ہے۔" شریف بولا۔

"ہُوں! تو پھر مجُھے اُس سے ملاقات کر لینی چاہیے۔"

"رشید علی کا کیا حال ہے؟" شریف نے پوچھا۔

"وہ اپنے گھر جا چُکا ہے۔" نامدار نے گول مول جواب دیا۔ "پھر آپ آڑھتی سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"ایک کام ہے۔"

"مجُھے تو دال میں کچُھ کالا کالا دکھائی دے رہا ہے۔" شریف بولا۔

"ایک دِن سب کچُھ معلوم ہو جائے گا۔ ہاں، ایک بات بتاؤ۔"

"سو باتیں پوچھیے۔"

"تُم دِن میں کتنی مزدوری کر لیتے ہو؟" نامدار نے پُوچھا۔

"یہی دس پندرہ روپے کی۔" شریف بولا۔

نامدار نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پندرہ روپے نکال کر اُسے دیے۔

"یہ لو، آج کی مزدوری۔"

"مگر میں سمجھا نہیں؟"

"سب کُچھ سمجھا دوں گا۔ تُم میری بات پر عمل کرتے رہو۔ تمھیں مزدُوری ملتی رہے گی اور پانچ روپے انعام بھی۔"

"میرا نام ہی شریف نہیں ہے، آدمی بھی شریف ہوں۔ کسی غَلط کام میں حصّہ نہیں لے سکتا۔" شریف بولا۔

"اگر تمھیں یہ شُبہ ہو کہ کام غَلط ہے تو تُم میرا ساتھ نہ دینا۔" نامدار نے کہا۔

"تب مُجھے منظور ہے۔"

"اچھّا تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"فیض باغ۔" نامدار بولا۔

دونوں ایک تانگے میں سوار ہو گئے۔ فیض باغ پہنچ کر نامدار نے شریف سے کہا۔ "تم مُجھے اِتنا بتا دو کہ اکبر کا دفتر یا گھر کہاں ہے؟"

"وہ سامنے والی گلی میں، دائیں ہاتھ والا مکان۔"

نامدار نے بازار میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "وہ دیکھو، سامنے چائے خانہ ہے، تُم وہاں جا کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر نامدار اُس گلی

میں داخل ہوگیا۔

ایک مکان کی نچلی منزل کے کمرے کے باہر اکبر امپورٹ ایکسپورٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ اندر ایک آدمی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ نامدار اندر داخل ہوا۔ سلام علیک کے بعد اُس نے پوچھا۔ "آپ اکبر صاحب ہیں؟" ادھیڑ عُمر کے سانولے رنگ کے صحت مند شخص نے کہا۔ "میرا نام ہی اکبر ہے۔ کہیے، کیا خدمت کروں؟"

"آپ کب سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کر رہے ہیں؟"

اکبر نے آنکھیں سکیڑ کر نامدار کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آپ یہ کیوں پُوچھ رہے ہیں؟"

"آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔"

"چار برس سے۔" اکبر لولا۔

"خُوب! پھر تو آپ کو اپنے کام کا خاصا تجربہ ہو گا۔ اصل میں مَیں خود یہی کام شروع کرنا چاہتا ہوں، اِس لیے آپ سے ملنے چلا آیا۔"

اکبر غور سے نامدار کر دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "میرا خیال ہے آپ ابھی یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے آپ کی عمر پندرہ سولہ سال سے زائد نہیں۔ یہ کام بڑا مُشکل ہے۔ حکومت بھی شاید اجازت نہ دے۔"

نامدار سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "اصل میں میں اپنی تعلیم چھوڑ چکا ہوں۔ ورثے میں مُجھے اچھی خاصی دولت ملی ہے، اِس لیے کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔

دو ایک باتیں بتا دیں تو شکر گزار ہوں گا۔"

"پوچھیے۔"

"پیسہ میرے پاس بہت ہے۔ کوئی سرپرست نہیں۔ آپ مشورہ دیں کہ کس کاروبار میں رقم لگاؤں کہ معقول فائدہ ہو۔"

اب اکبر کا لہجہ بدل چکا تھا۔ "چائے پئیں گے یا ٹھنڈا؟"

"گرمی کا موسم ہے۔" نامدار بولا۔ "ٹھنڈا ٹھیک رہے گا۔"

اکبر نے کسی کو آواز دی۔ ایک لڑکا آیا۔ اکبر نے اُسے ٹھنڈا لانے کے لیے کہا۔ پھر بولا۔ "آپ کتنی رقم کاروبار میں لگا سکتے ہیں؟"

"یہی کوئی چار پانچ لاکھ۔" نامدار بولا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں ایک گاؤں میں رہتا ہوں، لیکن اب شہر میں مُستقل ڈیرے ڈالنے کا ارادہ ہے۔ ایک کوٹھی بھی دیکھ چُکا ہوں۔ اُس کا سودا ہونے ہی والا ہے۔ وہ دس لاکھ مانگتے ہیں۔ میں نو لاکھ کہتا ہوں۔" لڑکا دو بوتلیں لے آیا۔ اکبر نے ایک بوتل نامدار کو دی اور بولا۔ "آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟"

"میرا نام نُور خان ہے۔" نامدار نے جواب دیا۔

"نور خان صاحب، امپورٹ ایکسپورٹ کے کام کے علاوہ میں کئی اور کاروبار بھی کرتا ہوں۔ غلّہ منڈی میں بھی اپنی آڑھت کی ایک دکان ہے۔"

نامدار نے اُس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مُسکرا کر کہا۔ "پھر تو میں بڑی صحیح جگہ آیا۔ اصل میں مَیں اِدھر سے گزر رہا تھا کہ اِس بورڈ پر نظر پڑ

گئی۔"

"آپ یہاں کس جگہ ٹھہرے ہیں؟"

نامدار نے ایک لحظہ کُچھ سوچا، پھر بولا:

"امپریل ہوٹل میں۔۔۔" اکبر نے مُسکرا کر کہا۔ "ممکن ہے ہم کوئی ایسا کاروبار کر سکیں جس میں ہم ایک دوسرے کے پارٹنر ہوں۔"

"ایسا ہوا تو میری پریشانی دور ہو جائے گی۔" نامدار نے کہا۔ "اصل میں روپیہ ہی میری پریشانی ہے۔ کسی کام میں لگانا چاہتا ہوں۔"

"اِس پر تو تفصیل سے بات چیت ہوگی۔ آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔"

نامدار نے چند منٹ کُچھ سوچا، پھر بولا۔ "آپ ایسا کریں، امپریل ہوٹل آ جائیں اور شام کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ کاروبار پر بھی بات چیت ہو جائے گی۔"

"اصولاً تو میرا حق بنتا ہے کہ آپ کی دعوت کروں۔"

"پھر کبھی سہی۔" نامدار نے کہا۔

"اچھّا، اب اجازت دیں۔ کتنے بجے پہنچ جائیں گے؟"

"آٹھ بجے ٹھیک۔"

اُس کے جانے کے بعد اکبر بُہت دیر تک مُسکراتا رہا۔

نامدار نے چائے خانے سے شریف کو ساتھ لیا۔ ایک دُکان سے دو تین

ریڈی میڈ سُوٹ اور ایک اٹیچی کیس خریدا۔ پھر رکشے میں بیٹھ کر اپیریل ہوٹل کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے شریف سے کہا :

"تمہارا آج کا کام ختم ہوا۔ کل صُبح نو بجے یہاں پہنچ جاؤ اور آج کا انعام لو۔

ہوٹل میں داخل ہو کر نامدار نے اپنے لیے کمرا بُک کرایا۔ اپیریل ہوٹل شہر کا سب سے بڑا اور مہنگا ہوٹل تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اُس نے لباس تبدیل کیا اور پھر بستر پر لیٹ کر اپنے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔

شام کو اُٹھ کر نہایا، نیا لباس پہنا اور اکبر کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک آٹھ بجے اکبر ہوٹل پہنچ گیا۔

کُچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر کاروباری بات شروع ہوئی۔ اکبر نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں شریک

کرنے کے لیے تیّار ہوں، کیونکہ میں اُسے بڑھانا چاہتا ہوں۔ اُس میں آپ چار لاکھ روپے کی رقم لگا دیں، پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کُچھ عرصے بعد آپ خود اِس کاروبار کے سارے گُر سیکھ جائیں گے، اور پھر اپنا کاروبار بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارا آپ کا معاہدہ کم از کم پانچ سال کے لیے ہو گا۔"

نامدار نے ایسا چہرہ بنا لیا جیسے وہ سنجیدگی سے کُچھ سوچ رہا ہو۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" اکبر نے پوچھا۔

"دراصل میں بہت منافع کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں، اور امپورٹ ایکسپورٹ کے بارے میں آپ نے جو کُچھ بتایا ہے اُس سے سے پتا چلتا ہے کہ یہ کام خاصا سُست رفتار ہے۔"

"آپ نے غلَط اندازہ لگایا ہے۔" اکبر بولا۔

"اچھّا، تجربے کے لیے یہی سہی۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

نامدار نے کھانا منگوایا۔ کھانے کے دوران میں وہ ایک دوسرے سے خاصے بے تکلّف ہو گئے۔ نامدار نے کہا:

"سُنا ہے بعض ناجائز کاموں میں بہت پیسہ ہے؟"

اکبر کو اب نامدار کی ناتجربہ کاری اور سادگی کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ وہ بولا:

"کیسے ناجائز کام۔۔۔؟"

"مثلاً چرس، افیون وغیرہ۔ سُنا ہے لوگ ایسے کاموں میں راتوں رات کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔"

"ہاں، ہے تو یہ سچ۔" اکبر بولا۔

"میرا ایک دوست ہے۔ وہ ایک بڑے جاگیر دار کا بیٹا ہے۔" نامدار بولا۔

"وہ مُجھے آج شہر میں ملا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں کاروبار میں روپیہ لگانے کی فکر میں ہوں۔ اُس نے مُجھے جو مشورہ دیا وہ میرے جی کو لگا۔"

اکبر کا ہاتھ رُک گیا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی دِکھائی دے رہی تھی۔

"کیسا مشورہ؟" اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں پُوچھا۔

"اُس نے بتایا کہ اُس کے علاقے میں چرس بہت سستی ہے۔ وہ میرا سودا کروا سکتا ہے۔"

اکبر کے ہاتھ سے کھانے کا چمچ گِر گیا۔ اُس نے کہا۔ "مگر اِس کے لیے تو بڑی رقم چاہیے۔"

"وہ کہہ رہا تھا، دس پندرہ لاکھ سے کام چل سکتا ہے، اور اتنی رقم لگانا میرے لیے کوئی مُشکل نہیں۔"

اکبر خاموش رہا۔ نامدار آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ "آپ کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم باہر چرس بھجوا سکیں؟ میری آپ کی پارٹنر شپ رہے گی۔"

اکبر سوچنے لگا، یا تو یہ لڑکا بے حد بے وقوف ہے یا پھر بہت ہوشیار۔ لیکن وہ ہاتھ آئی مُرغی کو چھوڑنے کے لیے تیّار نہ تھا۔ بولا "ایسا مُمکن ہے۔ مُجھے اُس کا بھی تجربہ ہے۔"

"بس تو پھر بات بن گئی۔" نامدار نے کہا۔ "اصل میں میرا دِل کہتا ہے کہ مُجھے آپ کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا چاہیے، ورنہ میں اپنے درست کی

خدمات بھی حاصل کر سکتا تھا۔"

"آپ مُجھ پر ہر طرح سے اعتماد کر سکتے ہیں۔" اکبر نے کہا۔ "لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟ کھُل کر بات کریں۔"

"اگر ہمیں چرس کا ناجائز دھندا شروع کرنا ہے تو پھر ہم آپس میں کسی قسم کا تحریری معاہدہ نہیں کریں گے۔ بلکہ اِس کے لیے ہمیں ایک دوسرے پر بھروسا کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ مُجھے منظور ہے۔" نامدار نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔

کھانا ختم کر کے جب وہ کافی پینے لگے تو بات آگے بڑھی۔ نامدار نے کہا۔
"میں کل گھر چلا جاؤں گا اور دو دِن بعد واپس آؤں گا، رقم لے کر۔"
"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" اکبر بولا۔

"ابھی میرا اکیلا جانا ہی ٹھیک ہے۔ آج کیا دِن ہے؟"

"منگل۔" اکبر نے کہا۔

"جُمعے کے دِن آپ سے ملاقات ہوگی۔ میں تب تک سب انتظام کر لوں گا۔"

"آپ انتظام کر لیں۔"

ناکام چوری

اکبراس ملاقات سے جتنا خوش تھا اُس کا اندازہ تو لگایا جا سکتا تھا، لیکن اِس
ملاقات سے جتنی مسرّت نامدار کو ہوئی تھی اُس کا اندازہ اکبر نہ لگا سکتا تھا۔
وہ آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کے اندازے صحیح ثابت ہوئے تھے۔
شریف نے اُسے اِطّلاع دی تھی کہ اکبر بُرے چال چلن کا آدمی ہے۔
آڑھتی سراج دین کا رشید علی سے جھگڑا۔ اُس کے بعد رشید علی کا اصرار کہ

وہ کُچھ نہ بتائے گا اور وہ دُشمنوں کے بڑے راز سے آگاہ ہے۔ اور پھر رشید علی کے گھر میں ایک صندُوق میں تین لاکھ روپے کی رقم کا پایا جانا۔

اِن باتوں پر نامدار نے پچھلے دو دِنوں میں بہت غور کیا تھا۔ رشید جیسے چھوٹے دُکاندار کے گھر سے تین لاکھ کی رقم کا ملنا صاف ظاہر کرتا تھا کہ وہ کوئی غَلط کام کرتا تھا، اور اِس غَلط کام کا اندازہ لگانا نامدار جیسے ذہین نوجوان لڑکے کے لیے مُشکل نہ تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ آرام دہ پلنگ پر میٹھی نیند سو گیا۔

صُبح کو ناشتے کے بعد اُس نے لباس بدلا اور باہر نکلا۔ ٹھیک نو بجے شریف بھی پہنچ گیا۔ نامدار نے پہلے شریف کو اُس روز کی مزدوری ادا کی، پھر کہا:

"کہو، کوئی نئی بات؟"

شریف ہنسنے لگا۔ "بولا کوئی خاص بات نہیں جو آپ کو بتا سکوں۔"

"تمہارا آڑھتی دُکان پر آگیا ہو گا؟"

"ہاں، اِس وقت وہ آجاتا ہے۔"

"چلو، ذرا اُس سے ملاقات کرلیں۔"

دونوں غلّہ منڈی کی طرف چل دیے۔ جب وہ منڈی کے قریب پہنچے تو نامدار نے شریف سے کہا؛

"آج سے تمہارا اصل کام شروع ہوتا ہے۔ یہ لو سو روپے میں تمہارے آڑھتی سے بات کر کے فوراً گھر جا رہا ہوں۔ جمعرات کو واپس آؤں گا۔ میرے آنے تک اپنے آڑھتی کی ایک ایک بات اور حرکت پہ نظر رکھنا۔ وہ کہیں جائے تو اس کا پیچھا کرنا۔"

"سمجھ گیا۔"

"تو پھر اب خُدا حافظ!"

سراج دین آڑھتی دکان پر بیٹھا تھا۔ نامدار کو دیکھ کر اُس نے بُرا سا مُنہ بنایا اور بے زاری سے بولا۔ "اب کیا بات ہے!"

"آپ کو ایک اِطّلاع دینے آیا ہوں۔"

"جلدی سے بتاؤ۔" "رشید علی جو آپ کے ہاں سودا لینے آتا تھا اور اُس پر کسی نے فیض باغ میں گولی چلائی تھی، اُس کی موت اُس گولی سے نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک اور وجہ سے ہوئی جو میں ابھی بتا نہیں سکتا۔ لیکن مُجھے معلوم ہے کہ اُسے خاموش رکھنے کے لیے اُس کے دُشمنوں نے اُسے ہسپتال میں کس طرح قتل کیا"

اِتنا کہہ کر نامدار اُٹھا اور دُکان سے باہر نکل گیا۔

سراج دین کا رنگ اُڑ چُکا تھا۔ وہ نامدار کو آواز دے کر بُلا بھی نہ سکا۔

جب نامدار قصبے میں داخل ہوا تو وہاں پھر کُہرام مچا ہوا تھا۔

"غضب خدا کا!" ایک شخص نے نامدار کو بتایا۔ "ایسا کبھی سُننے میں نہیں آیا کہ کسی کے ہاں مرگ ہوئی ہو اور پھر چور گھر میں گُھس آئے ہوں!"

"چوری؟ کس کے ہاں چوری ہوئی؟" نامدار کا دِل دھڑکنے لگا۔ "بے چاری سکینہ کے ہاں۔"

نامدار سکینہ کے گھر پہنچا۔ وہاں کئی لوگ جمع تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ سکینہ کا رنگ زرد تھا۔ وہ بہت پریشان دِکھائی دے رہی تھی۔

"میں تو آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔"

"کیا ہوا؟"

سکینہ اُسے مکان کی پچھلی دیوار کی طرف لے گئی جہاں ایک بڑا سا شِگاف دِکھائی دے رہا تھا۔ چور نقب لگا کر گھر کے اندر داخل ہوئے تھے۔

"کیسے ہوا یہ سب کُچھ؟" نامدار نے پوچھا۔

"میں سو رہی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا کہ کھڑاک سے میری آنکھ کھُل گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے اُٹھی۔ کمرے میں دیکھا۔ سب صندُوق کھُلے پڑے تھے۔ بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں بھی ہر چیز اُلٹی پُلٹی پڑی تھی۔ دُکان کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ چور جا چُکے تھے۔ میں چیخی تو لوگ اکٹھّے ہو گئے۔ ہائے ہائے! یہ کیا ہو رہا ہے!"

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" نامدار نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی کہ کوئی سُن نہ لے۔

"میں نے آپ کی بات پر عمل کیا تھا۔ وہ روپے چھُپا دیے تھے۔"

"پھر بھی تسلّی تو کر لی ہے کہ وہ اُسی جگہ موجود ہیں؟" نامدار نے پوچھا۔

"ہاں، تسلّی کر چکی ہوں۔ جس کمرے میں اُوپلوں کا ڈھیر پڑا ہے، اُسی کمرے کے اندر چھپائے تھے۔"

"شکر ہے، خُدا کا۔" نامدار نے کہا۔

"کسی کو خبر تھی کہ گھر میں روپیہ ہے۔" سکینہ بولی۔

نامدار نے اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "انہی کو عِلم ہوگا جنہوں نے رشید علی

کو قتل کیا۔"

"میرا ایک کام کیجیے۔" سکینہ بولی۔

"بولو، کیا کام ہے؟

"وہ روپے آپ اپنے گھر لے جائیں۔"

نامدار نے کُچھ دیر سوچا، پھر مُسکرا کر بولا۔ "مُجھ پر اعتبار ہے نا؟ بہت بڑی رقم ہے۔"

"مُجھے آپ پر پورا اعتبار ہے۔" سکینہ نے جواب دیا۔

"اچھّا تو کسی وقت چُپکے سے آؤں گا۔"

شام کو نامدار سکینہ کے گھر آیا اور روپے گُٹھڑی میں باندھ کر اپنے گھر لے گیا۔

کُنجی مِل گئی

نامدار جمعرات کی صُبح ہی بوبی پر سوار ہو کر شہر پہنچ گیا اور ہاشم خان تھانیدار نے ملاقات کی۔

"تمہارا ہر روز شہر آنا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔" ہاشم خان نے مُسکرا کر کہا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔" نامدار بولا۔ "مُجھے جلد ہی آپ کی مدد کی ضرورت

پڑے گی۔"

"میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔" ہاشم خان نے کہا۔ "لیکن بات کیا ہے؟ تُم مُجھ سے کُچھ چھُپا رہے ہو۔" تو ہاشم خان نے کہا۔

"مصلحت کا تقاضا ہے۔" نامدار بولا۔

"معاملہ بہر حال رشید علی کے قتل سے تعلّق رکھتا ہے۔"

"ہاں۔" نامدار نے جواب دیا۔

"رشید علی نے تمہیں ضرور کُچھ بتایا ہو گا۔"

"اُس نے جتنا کُچھ بتایا وہ میں نے بتا دیا تھا۔ باقی کُچھ میں نے خود کیا ہے۔"

"آخر مُجھے بھی تو کُچھ پتا چلے۔"

"تھوڑاانتظار کریں۔ سب کُچھ پتا چل جائے گا۔" نامدار نے کہا اور تھانیدار ہاشم خان سے اجازت لے کر غلّہ منڈی کا رُخ کیا۔ شریف چائے خانے میں موجود تھا۔

نامدار نے وہاں ٹھہرنا پسند نہ کیا اور شریف کو لے کر دوسرے بازار کے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

"کہو، کیا نئی بات ہوئی۔"

"بڑی حیرت کی باتیں ہوئی ہیں۔" شریف نے کہا۔

"اچھّا! کیسی حیرت کی باتیں؟"

شریف نے بتایا کہ جب وہ آڑھتی سراج دین سے مل کر باہر نکلا تو چند منٹ بعد سراج دین بھی باہر آگیا۔ وہ سیدھا کمپونڈر نذر کی دُکان پر گیا۔ نذر

وہاں موجود نہ تھا۔ آڑھتی نے رکشا کیا اور فیض باغ اپنے سالے کے گھر گیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے گیا۔ میں بازار میں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اکبر اور سراج دین اکٹھے باہر آتے دکھائی دیے۔ وہ ایک رکشے میں بیٹھے اور کمپونڈر کی دُکان پر جا کر اُترے۔ میں نے بھی رکشا لے لیا تھا۔ کمپونڈر نذر دُکان پر موجود تھا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ لے کر آڑھت کی دُکان پر آ گئے۔ وہاں نذر کافی دیر تک رہا اور جب وہ باہر نکلا تو بہت خوش دِکھائی دے رہا تھا۔"

نامدار ایک ایک بات غور سے سُن رہا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر اکبر بھی وہاں سے چلا گیا۔ تب سے سراج دین کُچھ مطمئن ہے۔"

نامدار کے دماغ میں کھلبلی سی مچ رہی تھی۔ کئی باتیں اُس کے ذہن میں

آئیں۔ پھر اچانک اُس خوشی سے کھِل اُٹھا اور وہ بے اختیار بولا:

"کُنجی مل گئی؟"

"کیسی کُنجی؟" شریف نے حیرت سے پوچھا۔

"تُم اپنا کام کرتے رہے اور سراج دین پر نظر رکھو۔"

کُچھ دیر بعد نامدار رکشے میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رکشا ہسپتال کے اندر رُکا اور نامدار تیزی سے باہر نکلا۔ اُس نے پولیس چوکی میں جا کر تھانیدار ہاشم خان سے بات کی۔ ہاشم خان نے کہا:

"ایک سپاہی اپنے ساتھ لے جاؤ، سفید کپڑوں میں۔"

"نہیں، ابھی اِس کی ضرورت نہیں۔" نامدار بولا۔

"سوچ لو! احتیاط اچھّی ہوئی ہے۔"

"آپ شام کو قصبے پہنچ جائیں۔" نامدار نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

نامدار نے بوبی کو اشارہ کیا۔ وہ دُلکی چلنے لگا۔ اُس کا رُخ غلّہ منڈی کی طرف تھا۔ منڈی میں جا کر اُس نے شریف کو بُلوایا اور اُسے کُچھ ہدایات دیں۔

"میرے گھر کا پتا تمھیں معلوم ہے۔ شام تک سراج دین پر نظر رکھو۔ پھر میرے گھر آ جانا۔" نامدار نے کہا۔

"اچھّا۔۔۔ لیکن یہ سب کُچھ کیا ہو رہا ہے؟" شریف نے پوچھا۔

"سب پتا چل جائے گا۔" نامدار بولا۔ "کُنجی مِل گئی ہے اور اب یہ تالہ کھُل جائے گا۔"

یہاں سے وہ کمپونڈر نذر کی دُکان پر گیا اور بوبی سے کہا :

"تم یہیں کھڑے رہو۔ باندھنے کا وقت نہیں۔" اور تیزی سے دُکان کے اندر داخل ہو گیا۔ نذر اُسے دیکھ کر چونکا اور بولا۔ "کیا چاہیے ؟"

"آپ کا نام ہی نذر ہے ؟"

"ہاں، میں ہی نذر کمپونڈر ہوں۔ آپ کو کیا چاہیے ؟"

"چند منٹ آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہاں کوئی نہیں ہے۔ لیکن ایسی کون سی بات ہے ؟" نذر کمپونڈر نے کہا۔

"آپ کی اصلیّت کھُل گئی ہے، جعلی ڈاکٹر صاحب۔" نامدار نے کہا۔

"کیا مطلب؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" بوکھلائے ہوئے کمپونڈر نے کہا۔

"وہی کہہ رہا ہوں جو تُم سُن رہے ہو۔" یہ کہہ کر نامدار نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تُم نے رشید علی کے زہر کا ٹیکا لگایا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ وہ گولی سے مرا تھا۔" نذر بولا۔

"تو تُم رشید علی کو جانتے ہو۔" نامدار نے کہا۔

"میں کسی کو نہیں جانتا۔ کون رشید علی؟" نذر کانپ رہا تھا۔

"تمہاری خیریت اِسی میں ہے کہ چُپ چاپ میرے ساتھ چلے چلو۔"

"مگر میں کیوں تمہارے ساتھ چلوں؟"

"اِسی میں تمہارا فائدہ ہے۔۔ مُمکن ہے جان بچ جائے۔" نامدار نے کہا۔

"جان؟ میری جان کو کیا خطرہ ہے؟"

"تُم کرائے کے قاتل ہو۔" نامدار بولا۔ "اگر تُم نے میرے ساتھ تعاون کیا تو تمہاری جان بچ جائے گی۔"

"تُم۔۔۔۔ تُم کون ہو؟ میں ابھی اکبر کو۔۔۔۔" وہ ایک دم رُک گیا۔

"کسی کو کُچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کُچھ جانتا ہوں۔ جلدی کرو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم چاہتے ہو کہ جنھوں نے تُم سے یہ کام کروایا، وہ بچ جائیں اور تُم مارے جاؤ؟"

کمپونڈر نذر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
"جلدی کرو، ورنہ ابھی پولیس آ جائے گی۔"

"لیکن کہاں چلوں؟"

"میرے ساتھ چلو۔ یہاں بات نہیں ہو سکتی۔ مُمکن ہے میرے تمہارے درمیان تصفیہ ہو جائے۔" مُمکن نامدار نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" کمپونڈر بولا۔

نامدار نے سخت لہجے میں کہا:

”شور کیا تو تمہارا ہی نقصان ہو گا۔ ابھی حقیقت کا علم صرف مُجھے ہے۔ پھر پوری غلّہ منڈی کو ہو جائے گا۔ تمہاری بہتری اِسی میں ہے کہ میرے ساتھ چلو۔“

بوبی بجلی بن گیا

نذر نے جلدی جلدی دُکان کا دروازہ بند کیا۔ جب وہ تالا لگا رہا تھا تو اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ نامدار نے اِدھر اُدھر دیکھا تو شریف پاس ہی کھڑا دِکھائی دیا۔ "گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔" نامدار نے نذر سے کہا۔

"مگر میں۔۔۔۔ تھوڑا۔۔۔۔۔" کمپونڈر نذر کانپ رہا تھا۔

"جلدی کرو!"

نذر ہچکچایا تو نامدار نے اُسے زبردستی گھوڑے پر بِٹھا دیا۔ خود بھی سوار ہو گیا۔ جب وہ شریف کے پاس سے گُزرے تو نامدار نے اُس سے کہا :

"اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میری دوسری ہدایت پر عمل کرنا۔"

شریف نے سر ہلا دیا۔ نامدار نے آگے جھُک کر بوبی کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور بولا :

"بوبی! بجلی کی طرح گھر چلو۔"

اور پھر لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک خُوب صُورت اور مضبُوط گھوڑا بازاروں میں سے بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ گھڑ سوار بھی ایک مضبوط اور خوب صورت لڑکا تھا۔ اور اُس کے آگے ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس کے

چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

چند منٹوں میں بوبی شہر کے باہر پہنچ چکا تھا۔ اُس کے آگے قصبے کو جانے والی پکّی سڑک تھی۔ بوبی اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ اُس کے نعلوں سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک گھنٹے سے بھی کم عرصے میں اُس نے نامدار اور نذر کو قصبے میں پُہنچا دیا۔

کمپونڈر نذر کو ایک کمرے میں لے جا کر نامدار نے اُس سے گفتگو شروع کی۔ آدھ گھنٹے میں ہی نذر نے ہر چیز بتا دی۔ نامدار نے اُسے آرام کرنے کے لیے کہا، پھر کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کیا اور ایک نوکر کو پہرے پر بٹھا دیا۔

اب اُس کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ شروع ہونے والا تھا، اور وہ مُسکرا

رہا تھا۔

اُدھر شریف سراج دین آڑھتی کی دُکان میں داخل ہُوا۔ سراج دین نے اُسے حقارت سے دیکھا اور بولا:

"باہر جا کر بیٹھو۔"

"آپ سے ایک بات کرنی ہے، جناب۔"

"میں پیسے نہیں دے سکتا۔ جب دیکھو اُدھار مانگنے چلے آتے ہو۔"

"میں اُدھار مانگنے نہیں آیا ہوں۔" شریف بولا۔ "آپ کو بتانے آیا ہوں کہ وہ لڑکا جو کل یہاں آیا تھا، وہ۔۔۔۔"

اتنا کہہ کہ شریف خاموش ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سراج دین کا رنگ پیلا

پڑگیا ہے۔ وہ چیخ کر بولا :

"کیا ہُوا اُسے ؟ کیا کِیا اُس نے ؟ جلدی بکو۔"

شریف اب دِل ہی دِل میں لُطف لینے لگا تھا۔ بولا۔ "جی، وہ اُسے گھوڑے پر بِٹھا کر لے گیا۔"

"کسے ؟ کسے لے گیا؟" سراج دین کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

"جی، وہ۔۔۔۔۔ کیا نام اُس کا۔" شریف جان بُوجھ کر سراج دین کو زِچ کر رہا تھا۔ "جی، وہ کیا نام ہے اُس کا۔۔۔ وہ کمپونڈر۔۔۔۔"

"نذر۔" یہ کہہ کر سراج دین اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سارے بازار نے دیکھا، گھوڑا ہوا کی طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ نذر کو گھوڑے

پر بٹھا کر لے گیا۔"

آڑھتی سراج دین کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ دھپ سے نیچے بیٹھ گیا۔

"جناب، خیریت تو ہے؟ پانی لاؤں؟"

"کتنی دیر ہوئی؟" سراج دین نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ایک گھنٹا ہوا ہو گا۔" شریف نے کہا۔ حالانکہ اِس واقعے کو پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے۔

"تُم نے اُسے روکا نہیں؟"

"جناب، میں اُسے کیوں روکتا؟"

"اچھّا، تُم جاؤ۔" سراج دین نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

شریف مُسکراتا ہوا باہر آ گیا اور دُکان کے سامنے دوسرے مزدوروں کے پاس بیٹھ گیا۔

سراج دین نے پانی منگوا کر پیا، پھر ٹیلی فون کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ بعد اکبر اُس کی دُکان پر پہنچ گیا۔ سراج دین اُس کو لے کر دُکان کے اندرونی حصّے میں چلا گیا۔ دونوں کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جب اکبر باہر نکلا تو شریف نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ شریف نے سوچا اب کیا کروں؟ اِس کا پیچھا کروں یا پھر سراج دین کی نگرانی کروں؟ اُس نے سراج دین کی نگرانی کرنے کا ہی فیصلہ کیا۔

سراج دین تین گھنٹے بعد دُکان سے نکلا۔ اُس نے شریف کو گھُور کر دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ شریف اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

خُفیہ گودام

سراج دین نے ایک رکشا رُکوایا تو شریف نے جلدی سے دوسرا رکشا پکڑا اور رکشے والے کو بتایا کہ اُسے سامنے جانے والے رکشے کا پیچھا کرنا ہے۔ سراج دین کا رکشا شہر سے باہر نکل کر ایک جگہ رُک گیا۔ جب سراج دین نے رکشے والے کو فارغ کر دیا تو شریف نے بھی رکشا چھوڑ دیا اور کافی فاصلہ رکھ کر سراج دین کا تعاقب کرنے لگا۔

ایک گلی میں ایک چھوٹی سی نئی بستی تھی۔ اُس کی ایک گلی میں سراج دین داخل ہوا۔ شریف گلی کے موڑ پر رُک گیا اور اُس نے جو کُچھ دیکھا، وہ اُس کے لیے دلچسپ اور حیران کُن تھا۔

گلی کے ایک مکان کے باہر دو ریڑھے کھڑے تھے، اور مزدور اُن میں سے بوریاں اُتار اُتار کر مکان کے ایک کمرے کے اندر لے جا رہے تھے۔ اکبر اُن مزدوروں کی نگرانی کر رہا تھا۔

شریف نے دِل میں سوچا: سراج دین کا گودام تو غلّہ منڈی والی دُکان میں ہے اور دوسرا گودام نُور پور محلّے میں ہے۔ کیا یہ تیسرا گودام ہے؟ لیکن جتنا سامان اُتارا جا رہا ہے، اِتنا تو اُن گوداموں میں بھی آسانی سے آ سکتا تھا۔ پھر اِس نئے گودام کی ضرورت اِن کو کیوں پڑی؟"

شریف کی ساری عُمر غلّہ منڈی میں گُزری تھی۔ اُس کے لیے یہ اندازہ لگانا مُشکل نہ تھا کہ یہ نیا گودام دراصل خُفیہ گودام ہے اور یہاں کوئی خاص چیز رکھی جا رہی ہے۔

وہ گلی کے موڑ پر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا، اور دِل ہی دِل میں ساری کہانی کا تانا بانا بُنتا رہا۔

اُس نے نامدار کے کہنے پر آڑھتی کو بتایا تھا کہ نامدار کمپونڈر کو گھوڑے پر ڈال کر لے گیا ہے۔ سراج دین آڑھتی نے اپنے سالے اکبر کو فون کیا۔ اکبر اُس سے ملنے فوراً غلّہ منڈی پہنچا۔ دونوں اندر کے کمرے میں چلے گئے اور وہیں فیصلہ ہوا کہ کُچھ مال کسی خُفیہ جگہ پہنچا دیا جائے۔ اکبر انتظام کرنے چلا گیا۔ بعد میں سراج دین یہاں پہنچ گیا۔ اب بات پوری طرح شریف پر واضح ہو گئی تھی۔ خُفیہ گودام، خُفیہ مال۔۔۔ چھاپے کا ڈر۔ ریڑھے والے

ریڑھے خالی کر کے جانے لگے تو شریف ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی اُسے پہچان نہ لے۔ پھر وہ سوچنے لگا اب اُسے کس کا تعاقب کرنا ہے۔

اکبر اور سراج دین اکٹھے گلی سے باہر نکلے۔ کُچھ دور جا کر اُنہوں نے ایک رکشا روکا اور اُس میں بیٹھ گئے۔ شریف نے بھی ایک رکشا روکا اور اُس کو آگے جانے والے رکشے کے پیچھے لگا دیا۔

اُسے یاد آیا کہ آج شام کو اُسے نامدار کے گھر پہنچنا ہے۔ اب وہ اُسے بہت باتیں بتانے کے قابل ہو گیا تھا۔

سراج دین کا رکشا فیض باغ جا کر رُکا اور اکبر نیچے اُترا۔ پھر وہی رکشا سراج دین کو غلّہ منڈی لے کر چلا گیا۔

شریف نے بھی غلّہ منڈی پہنچ کر رکشے کو چلتا کیا اور سراج دین کی دُکان
کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

کل نہیں، آج!

نامدار نے پہلے گھڑی پر نگاہ ڈالی، پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ دھوپ میں تیزی تھی۔ ہوا بند تھی۔ لیکن کام کی اہمیّت اپنی جگہ تھی۔ وہ اصطبل میں گیا۔ بوبی اُسے دیکھ کر خُوشی سے ہنہنایا۔

”دوست! پھر شہر جانا ہے۔ تین بج رہے ہیں، اور ہمیں چھ بجے سے پہلے پہلے واپس آنا ہوگا۔ گرمی بہت ہے۔ کہو، چلو گے؟“

بوبی نے سر ہلایا، جیسے کہہ رہا ہو: میں تو ہوا کی طرح اُڑ کر جاؤں گا۔"

نامدار بوبی پر سوار ہو گیا اور وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اس بار نامدار نے بوبی کی رفتار ذرا سُست رکھی۔ جب وہ شہر پہنچے تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔

اکبر کے دفتر کا دروازہ کھُلا تھا، اور وہ دفتر میں موجود تھا۔ نامدار کو گھوڑے سے اُترتے دیکھا تو وہ چونکا۔ اُس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔

نامدار مُسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور بولا۔ "کہیے جناب، مجُھے ایک دِن پہلے دیکھ کر حیران ہو گئے؟"

اکبر کا غصّے سے بُرا حال تھا، لیکن وہ غصّے کو چھُپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی۔ آئیے، آئیے۔" اُس نے بڑی مُشکل سے کہا۔

"جو کُچھ میں آپ کو بتاؤں گا، اُس سے آپ اور زیادہ خوش ہوں گے۔"

اکبر نے اُس کے طنز کو صاف محسوس کرلیا تھا، لیکن وہ خاموش رہا۔

"ٹھنڈا گرم نہیں پُوچھیں گے؟" نامدار نے مُسکرا کر کہا۔

اکبر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوا۔ لیکن پھر بیٹھ گیا۔ نامدار کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میں ایک سودا کرنے آیا ہوں۔"

"کیسا سودا؟" اکبر نے تیزی سے کہا۔

"کمپونڈر نذر میرے قبضے میں ہے۔" نامدار نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ تُم نُور خان نہیں بلکہ۔۔۔۔"

"بالکل ٹھیک۔" نامدار نے بات کاٹ کر کہا۔ "میرا نام نامدار ہے؟"

"تُم۔۔۔۔ تُم۔۔۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟" اکبر غصّے سے بولا۔

نامدار نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو وہی کُچھ سمجھتا ہوں، جو میں ہوں؟"

"کام کی بات کرو۔" اکبر دہاڑا۔

"اطمینان سے میری بات سُنو، اطمینان سے۔" نامدار بولا۔ "ہم دونوں پارٹنر بننے والے ہیں۔ میرے پاس روپیہ ہے۔ اگر تُم یہ جان گئے ہو کہ میرا نام نامدار ہے تو یہ بھی جان چکے ہو گے کہ میں معمولی اسامی نہیں ہوں۔ میں تمہارے ساتھ اب بھی سودا کرنے کو تیّار ہوں۔"

"کیسا سودا؟"

"اُس کی تفصیل یہاں طے نہیں ہو سکتی۔ تُم اور تمہارا بہنوئی دونوں جو کُچھ ہیں، مُجھے معلوم ہو چکا ہے۔ جو خُفیہ دھندا کرتے ہو، وہ بھی میرے عِلم

میں ہے۔ رشید علی کیوں قتل ہوا، اُس کا ثبوت میرے پاس ہے۔ جِن تین لاکھ رُوپوں کے لیے تُم لوگوں نے سکینہ کے گھر نقب لگائی، مُجھے اُس کا بھی علم ہو چکا ہے۔" نامدار مُسکرایا۔ "اور پھر کمپونڈر نذر میرے قبضے میں ہے؟"

"تُم کیا چاہتے ہو؟" سہمے ہوئے اکبر نے پوچھا۔

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پاس سب معلومات ہیں۔ کمپونڈر اپنی کھال بچانے کے لیے تمہاری پروا نہیں کرے گا۔ تُم اور تمہارا بہنوئی کہیں بھاگ نہیں سکتے، کیونکہ میرے آدمی تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ اِس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ معاملہ بخیر و بخوبی طے ہو جائے۔"

"تُم کوئی چال چل رہے ہو۔" اکبر بولا۔

"میں چال چل رہا ہوں یا معاملے کو نمٹانا چاہتا ہوں، اِس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

"تُم آخر چاہتے کیا ہو؟"

نامدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "آج شام سات بجے تک تم اور سراج دین میرے گھر پہنچ جاؤ۔ معاملے کی بات وہاں ہو گی۔ اگر تُم سات بجے تک وہاں نہ پہنچے تو پھر نتیجے کے تُم خود ذمّے دار ہو گئے۔"

اکبر بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "آج کے بجائے کل شام رکھ لو۔"

نامدار نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کل نہیں، آج۔ آج شام۔۔۔ ٹھیک سات بجے۔"

اِس کے بعد وہ اکبر کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

وہ بوبی پر سوار پکّی سڑک سے پر اُترا تو شریف دِکھائی دیا۔ اُس نے گھوڑا روک لیا۔

"تُم آ گئے۔"

"ہاں، پکّی سڑک تک بس پر آیا۔ کوئی تانگہ نہیں ملا تو پیدل ہی چل پڑا۔"

نامدار نے گھڑی میں وقت دیکھا، پھر بوبی کی پیٹھ سہلائی اور بولا۔ "بوبی، شریف بھی اپنا دوست ہے۔ اِسے بھی سوار کر لو۔"

بوبی ہنہنایا۔ نامدار نے شریف سے کہا۔ "آؤ، تم بھی سوار ہو جاؤ۔ بوبی نے اجازت دے دی ہے۔"

"نہیں۔ یہ تھکا ہوا ہو گا۔ میں پیدل پہنچ جاؤں گا۔" شریف نے کہا۔

"ہمارا بوبی کبھی نہیں تھکتا۔ جلدی کرو۔" یہ کہہ کر نامدار نے سہارا دے کر شریف کو اپنے آگے بٹھا لیا۔ بوبی بھاگنے لگا۔

"خدا اِسے نظرِ بد سے بچائے۔ بڑا سمجھ دار اور وفادار گھوڑا ہے۔" نامدار نے کہا۔ پھر شریف سے پوچھا۔ "کوئی نئی خبر؟"

شریف نے پوری تفصیل سے سراج دین کے خُفیہ گودام کا قصّہ بیان کیا۔ نامدار بہت خُوش ہوا۔ اُس نے کہا :

"شریف، تُم سچ مُچ شریف ہو۔ کیوں منڈی میں جان مار رہے ہو۔ میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمھیں معقول تنخواہ دوں گا۔ تمھارا گھر بھی بس جائے گا۔"

شریف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا۔ "میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ کوئی بڑا ہوتا تو یوں مارا مارا نہ پھرتا۔ نہ گھر نہ گھاٹ۔"

نامدار نے ہنس کر کہا۔ ”تو بس پھر بات پکّی ہو گئی۔ آج سے میں تمہارا بڑا بن جاتا ہوں۔“

اقرار اور اِنکار

نامدار نے گھر پہنچ کر شریف کو ایک آدمی کے سپرد کیا اور اُس سے کہا کہ وہ اب آرام کرے۔ جب اُس کی ضرورت ہو گی بُلوا لیا جائے گا۔ بوبی کو خُوب پیار کر کے اُس نے اصطبل میں بھجوا دیا اور باورچی کو کئی آدمیوں کے لیے نفیس کھانے پکانے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد وہ اُس کمرے میں گیا جہاں کمپونڈر نذر بند تھا اور ایک آدمی دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔

نذر پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ نامدار کو دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو۔ آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔ مگر میرا چھٹکارا کب ہو گا؟"

"بہت جلد۔" نامدار نے کہا۔ "اتنی بے چینی اچھّی نہیں ہوتی۔ انتظار کرو۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا اور چند ملازموں کو بُلا کر ایک خاص کمرا تیّار کرنے کا حُکم دیا۔ یہ کمرا بہت بڑا تھا۔ اُس کے اندر ایک دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جو اندر سے کھُلتا تھا۔ اُس نے اُس دروازے کے پاس کرسیاں لگوائیں۔ اِس کے بعد دوسرے کمرے کے اندر گیا جس کا دروازہ اُس بڑے کمرے کے اندر کھُلتا تھا۔ اُس نے اِس کمرے میں بھی اندر کھُلنے والے دروازے کے پاس کُرسیاں رکھوائیں۔ جب وہ اِن انتظامات سے

مُطمئن ہو گیا تو مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔

سب سے پہلے تھانیدار ہاشم خان اور چار سپاہی پہنچے۔ نامدار نے اُن کو اُس چھوٹے کمرے میں بِٹھایا جس کا دروازہ بڑے کمرے کے اندر کھُلتا تھا، لیکن اُس وقت بند تھا۔

تھانیدار ہاشم خان بے چین تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا کُچھ ہوا ہے اور کیا کُچھ ہونے والا ہے۔

"آپ کو میں ایک زحمت دُوں گا۔ آپ اِس کمرے میں اُن کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ دوسرے کمرے میں بولا جانے والا ایک ایک لفظ آپ کو پوری طرح سُنائی دے گا۔"

"پھر؟" تھانیدار ہاشم خان نے کہا۔

"پھر آپ کو ترقّی ملے گی۔" نامدار نے جواب دیا۔

"مذاق نہ کرو، نامدار۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ آپ کا کام ہے ہر بات غور سے سُننا۔ اور جب میں کہوں 'قصّہ ختم ہوا' تو آپ اپنے سپاہیوں کو لے کر بڑے کمرے میں آ جائیں۔ قصّہ ختم کرنے کی سب تیّاریاں مکمّل ہو چُکی ہیں۔"

تھانیدار اور اُس کے سپاہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اِس وقت ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی۔ "جناب، دو آدمی آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

نامدار نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا: "سراج دین آڑھتی اور اکبر۔"

پھر اُس نے تھانیدار ہاشم خان کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکلتے

ہوئے کہا۔ "اب انتظار ختم ہوتا ہے۔"

اُس نے اکبر اور سراج دین کا گرم جوشی سے اِستقبال کیا۔ وہ دونوں بہت گھبرائے اور سہمے ہوئے تھے۔ وہ اُنہیں اُسی بڑے کمرے میں لے آیا جہاں اُس نے دروازے کے پاس کرسیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف ہاشم خان تھانیدار اور اُس کے سپاہی بیٹھے تھے۔

مُلازم شربت لے آیا۔ نامدار نے اکبر اور سراج دین کو اصرار سے شربت پلایا، پھر پوچھا :

"یہاں پہنچنے میں کوئی دقّت تو نہیں ہوئی؟"

سراج دین نے کہا۔ "اِن باتوں کو چھوڑو، کام کی بات کرو۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

نامدار نے مُلازم کو بُلوایا، برتن اُٹھوائے اور کمرا اندر سے بند کر لیا۔

"سراج دین صاحب، میں جو پوچھوں آپ مُجھے اُس کا صحیح جواب دیں۔" نامدار نے کہا۔

"باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ سیدھی طرح بات کرو۔"

"آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔" نامدار نے زور دے کر کہا۔ "یہ بہت ضروری ہے۔"

"اچھّا، تو پھر پوچھو۔" سراج دین بولا۔ "ہمارے قصبے کا ایک دُکان دار رشید علی آپ کی آڑھت سے سودا لیتا تھا۔"

"ہاں؟"

"آپ نے اُس کو ناجائز کاروبار میں شریک کر لیا۔" نامدار نے کہا۔

"نہیں۔۔ یہ ہماری بد قسمتی تھی۔" سراج دین بولا۔ "وہ ہمارے لیے مُصیبت بن گیا۔ ایک دِن وہ سودا لینے آیا تو غَلطی سے اپنے ساتھ افیون کا ایک تھیلا بھی لے گیا جو میں نے ایک گاہک کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ اُس کے سامان میں مل گیا۔ مُجھے بعد میں اپنی غَلطی کا احساس ہوا۔ میں اُس کے گھر گیا۔۔۔۔۔"

"میں سمجھ گیا۔" نامدار بولا۔ "وہ امیر بننا چاہتا تھا۔ اُس نے راز کی قیمت مانگی۔ آپ نے اُس کا مُنہ بند کرنے کے لیے اُسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ لیکن اُس کے مطالبے بڑھتے گئے۔ وہ آپ سے زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھنا چاہتا تھا، اور اِس عرصے میں وہ تین لاکھ روپے جمع کر چُکا تھا۔ جب اُس نے آپ سے زیادہ رقم مانگی تو جھگڑا ہو گیا۔"

”وہ لالچی تھا۔ حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اِس لیے جھگڑا ہوا۔“

”بہر حال تُم نے اُسے دھمکایا۔ جب جواب میں وہ بھی بولا، تو تُم نے اُسے اکبر کے پاس جانے لیے کہا۔ ٹھیک ہے نا؟“ نامدار نے پوچھا۔

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔“ اکبر نے کہا۔ ”وہ بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ مُجھے ملا تو میں نے اُس سے رات کو آنے کے لیے کہا اور پھر جو ہوا وہ تمہیں معلوم ہے؟“

”گولی تُم نے چلائی تھی؟“ نامدار نے پوچھا۔

”میں نے ہی چلائی تھی۔“ اکبر بولا۔ ”لیکن وہ بچ گیا۔ مگر اِن باتوں کا فائدہ؟“

”فائدہ ہے، کیونکہ، کیونکہ سب باتوں کی تصدیق کے بعد ہی میں تُم سے کوئی

سودا کر سکوں گا۔" نامدار نے کہا۔ "جب وہ زندہ بچ گیا تو تُم نے دس ہزار کے عوض کمپونڈر نذر کو اُسے قتل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ نذر اپنی دُکان پر افیون بھی تم سے لے کر بیچتا تھا۔"

اکبر اور سراج دین کمپونڈر نذر کو گالیاں دینے لگے۔

نامدار نے کہا۔ "گالیاں دینے سے کُچھ فائدہ نہیں۔ بات صاف ہو گئی ہے۔ تُم نے پہلے رشید علی کو غَلَط راستے پر چلایا، پھر اُس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ جب وہ بچ نکلا تو نذر سے زہر کا ٹیکا لگوا کر مروا دیا۔"

"پھر؟" سراج دین نے غصّے سے کہا۔ "اصل بات کرو۔"

"پھر یہ کہ تُم نے رشید علی کے گھر نقب لگوا کر تین لاکھ کی رقم چوری کرنی چاہی۔"

"مگر ہمیں رقم وہاں نہیں ملی۔" اکبر بولا۔

"بالکل ٹھیک۔" نامدار نے کہا۔ "رقم تمہارے ہاتھ نہیں لگ سکی۔"

"وہ رقم اب تمہارے پاس ہے۔" اکبر نے کہا۔

"ہاں، میں جھوٹ کیوں بولوں۔" نامدار نے کہا۔ "وہ رقم میرے پاس ہے۔"

تُو بس پھر وہ رقم اپنے پاس رکھو اور ہماری خلاصی کرو۔" اکبر بولا۔

"خوب! کیا عقل پائی ہے! معاملہ ایسے طے نہیں ہو گا۔"

"تو پھر کیسے طے ہو گا؟ جلدی بتاؤ!" سراج دین نے کہا۔

نامدار نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہنا شروع کیا۔ "اگر نذر وعدہ معاف

گواہ بن جائے تو اُس کی جان بچ سکتی ہے۔ تُم دونوں نے جو جرم کیا ہے، اُس کی سزا موت ہے، اور ساری جائیداد کی ضبطی۔ اِن سزاؤں سے تمھیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ اب میرے ساتھ سودا کرتے وقت اپنی جان اور جائیداد کی قیمت کو بھی دھیان میں رکھنا۔"

"یہ زیادتی ہے۔" اکبر بولا۔

"تُم نے ایک انسان کی جان لی۔ کیا یہ زیادتی نہیں؟" نامدار بولا۔

"ہمارا کاروبار اب مندا ہے۔" سراج دین بولا۔ "حکومت بہت سختی کر رہی ہے۔ تُم تین لاکھ روپیہ وہ بھی رکھو اور دو لاکھ اور ہم تمھیں دینے کے لیے تیّار ہیں۔"

"صرف دو لاکھ؟"

"یہ دو لاکھ بھی بڑی مُشکل سے ادا کریں گے۔" اکبر نے کہا۔

"تمہاری جائیداد بس اتنی ہی ہے؟ ناجائز مال بالکل نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں۔" سراج دین بولا۔

"دیکھو، میرے ساتھ جھوٹ بولنے سے کام نہیں چلے گا۔

"اگر تُم ہمیں پولیس کے حوالے کر دو گے تو تمہیں کیا ملے گا؟" اکبر نے پوچھا۔ "پانچ لاکھ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔"

"مُجھے اِدھر اُدھر مت اُلجھاؤ۔" نامدار نے کہا۔ "بات کا صحیح جواب دو؟"

"ہم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ہر بات قبول کرلی ہے۔" سراج دین نے کہا۔

"پھر سوچ لو۔" نامدار نے کہا۔ "تمہارے پاس نا جائز مال بالکل نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں؟"

"پھر میرے تمہارے درمیان کوئی سودا نہیں ہو سکتا۔ نذر اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں پھانسی لگوا دے گا اور تمہاری ساری جائیداد بھی ضبط ہو جائے گی۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اکبر اور سراج دین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اکبر بولا۔ "آخری بات تین لاکھ وہ اور تین لاکھ ہم دیتے ہیں۔ کمپونڈر نذر کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"تاکہ تُم اُسے جان سے مار سکو۔" نامدار نے کہا۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"مُجھے تُم پر اعتبار نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تُم میرے ساتھ سچ بولتے، لیکن تُم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے خیال میں تمھیں اپنی جان پیاری نہیں ہے۔"

"ہم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" سراج دین نے گِڑگِڑا کر کہا۔ "ہمیں اپنی جان پیاری ہے۔ اگر رشید علی ہمیں تنگ نہ کرتا تو ہم اُس کی جان نہ لیتے۔"

"میں جھوٹوں کی کوئی بات نہیں مانتا۔" نامدار نے کہا۔ "تُم بار بار ہمیں جھوٹا کہہ کر ہماری بے عزّتی کر رہے ہو۔" اکبر نے غصّے سے کہا۔

نامدار نے مُسکرا کر کہا۔ "آج نئی بستی کے خُفیہ گودام میں جو مال پہنچایا گیا ہے، وہ کیا تھا؟ تُم سمجھتے ہو کہ میں بے خبر ہوں؟"

اکبر اور سراج دین کا جھُوٹ کھُل چُکا تھا۔ اُن کے سر جھُک گئے تھے۔

نامدار نے اُٹھ کر اونچی آواز میں کہا:

"قصّہ ختم ہوا!"

قصّہ ختم ہوا

دوسرے کمرے میں تھانیدار ہاشم خان اور اُس کے سپاہی ہر بات غور سے سُن رہے تھے۔ ہاشم خان نے سُنا کہ قصّہ ختم ہوا تو وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اُس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں نامدار اکبر اور سراج دین بیٹھے ہوئے تھے۔

تھانیدار اور سپاہیوں کو دیکھ کر اکبر اور سراج دین ہڑبڑا کر اُٹھے اور بھاگنے

لگے۔ سپاہیوں نے اُنہیں جلد ہی قابو میں کر کے ہتھکڑیاں لگا دیں۔

نامدار نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ بیٹھ گئے تو نامدار نے مُلازموں کو بلایا اور اُن سے کہا۔ "کھانا لے آؤ۔"

"رہنے دو۔" ہاشم خان بولا۔ "دیر ہو جائے گی۔"

"نہیں جناب، کھانا تیّار ہے۔ اِن کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ یہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔"

مُلازم کھانا لے کر آ گئے جو میز پر لگا دیا گیا۔ شریف کو بھی نامدار نے بُلوا لیا تھا۔

اکبر اور سراج دین کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ وہ کھانا کھانے کو تیّار نہ تھے۔ اُنہیں معلوم ہو چُکا تھا کہ اُن کا قصّہ ختم ہو چکا۔ لیکن نامدار کے اصرار

پر اُنھوں نے چند لُقمے کھا لیے۔

اکبر اور سراج دین کے پھر ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ اُن دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کمپونڈر نذر کو دوسرے کمرے میں علیحدہ کھانا دیا گیا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چُکا تو ملازم نے آ کر نامدار کو اِطّلاع دی کہ مہمان کھانا کھا چکا ہے۔

"اسے یہاں لے آؤ۔" نامدار نے حُکم دیا۔

تھوڑی دیر میں نذر بھی وہاں آ گیا۔ اکبر اور سراج دین نے ایک بار اُسے دیکھا پھر نظریں جھُکا لیں۔ نذر اُن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

نامدار نے ہاشم خان کی طرف دیکھا تو اُس نے نذر سے کہا :

"ہم تمھیں ہتھکڑی نہیں لگائیں گے۔ لیکن یاد رکھو! اگر تُم نے اپنے بیان

سے پھرنے کی کوشش کی تو تُم بھی مارے جاؤ گے۔"

نذر کمپونڈر نے کانپتے ہوئے تھانیدار کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نامدار، تُم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔" ہاشم خان بولا۔ "تم نے مُلک و قوم کے دُشمنوں کو گرفتار کرایا ہے۔"

نامدار خاموش رہا۔ تھانیدار بولا۔ "اب سلنا چاہیے۔ اِن کو بھی اپنی اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ میں شریف کو ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ یہ خُفیہ گودام کا پتا بتائے گا۔"

اکبر اور سراج دین نے ایک بار پھر نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور شریف کی طرف دیکھا۔

"چند منٹ ٹھہریے۔" نامدار نے کہا۔ اُسی وقت سکینہ اندر داخل ہوئی۔

نامدار نے اکبر اور سراج دین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "انہیں دیکھ لو۔ یہ تمہارے خاوند رشید علی کے قاتل ہیں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

سکینہ نے اپنے خاوند کے قاتلوں کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر آنسو بہاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"اب آپ انہیں لے جائیے۔" نامدار نے تھانیدار ہاشم خان سے کہا۔ "میرا فرض پورا ہو چُکا ہے۔

ہاشم خان نے نامدار کو گلے سے لگایا، پھر ہاتھ ملایا اور مُجرموں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی جیپ گاؤں کی حدود سے باہر جا رہی تھی۔

دوسرے دِن شریف شہر سے واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ نامدار اپنے گھوڑے بوبی کی لگام پکڑے آہستہ آہستہ چل رہا ہے اور گھوڑے پر ایک بچّی سوار ہے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ پھر شریف نے اُسے بتایا کہ اُس خُفیہ گودام سے سمگل شدہ الائچی کی بیس بوریاں بھی ملی ہیں اور افیون کے دس تھیلے بھی۔"

"لاکھوں کروڑوں کا مال ہوا پھر تو۔" نامدار نے کہا۔

"یہ بچّی کون ہے؟" شریف نے پوچھا۔

"یہ رشید علی مرحوم کی بیٹی ہے۔ سُنو شریف تمھیں ایک کمال کی بات بتاؤں۔"

"بتائیے۔" شریف نے اشتیاق سے کہا۔

"رشید علی کی بیوہ سکینہ بُہت شریف اور ایمان دار ہے۔ دُنیا کو اُس کی ایمان داری سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اُس کے خاوند نے حرام کی کمائی سے جو تین لاکھ روپے کمائے تھے، وہ سکینہ نے حکومت کو دے دیے ہیں۔ وہ حرام کا ایک پیسہ بھی اپنے گھر رکھنا نہیں چاہتی۔ پھر اُسی پیسے نے تو اُس کے شوہر کی جان لی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنی بچّی کو پال لوں گی۔"

"بڑی نیک عورت ہے، جی۔" شریف بولا۔

"میں خود سکینہ کی بیٹی کو پڑھاؤں گا۔" نامدار بولا۔

شریف نے بچّی کو پیار کیا۔ بوبی بھی خوشی سے ہنہنانے لگا۔

ختم شد